نَصْرٌ مِّنَ اللّٰہِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ

ہفت روزہ

نصرت

لاہور

٦٠

اتوار، ١٦ر نومبر، ١٩٦٩ء

ذوالفقار علی بھٹو

حیدرآباد کنونشن (١٩٦٨ء) کا خطبۂ صدارت

ایک اہم مضمون

بیگم نصرت بھٹو

عوامی تحریک کی وہ عظیم شخصیت جس نے چیئرمین بھٹو کی گرفتاری کے دوران جگہ جگہ عوام کی مجاہدانہ قیادت کی۔

مدیر: محمد حنیف رامے

٣٠ پیسے

پڑھنے والے لکھتے ہیں

انجمن

اُتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دَباؤ دوگے

پیر علی محمد راشدی کے "ہذیان" کا عبدالحق سونگی صاحب نے بڑا مدلّل جواب دیا ہے۔ نصرت نے اس مطلبی انسان کا پول کھول کر موقع دیا ہے کہ اس کے بارے میں کچھ اور حقائق بھی سامنے لائے جائیں۔

پیر صاحب کو جب یہ معلوم ہُوا کہ ایوّب خان اور بھٹّو صاحب میں اختلافات پیدا ہوگئے ہیں تو انہوں نے وزارت کی امید میں کئی جوڑے جُوتیاں گھِسا دیں لیکن ایوب خان نے گھاس نہ ڈالا۔ اس پر پیر صاحب نے "جنگ" کے کالموں میں معاہدۂ تاشقند کی حمایت میں یہاں تک لکھا کہ یہ صلح حدیبیہ کے مثل ہے۔ پیر صاحب نے یہ جسارت بھی کی کہ چین کے بارے میں لکھا کہ وہ ہماری عملی مدد کرنے کے قابل نہیں حالانکہ یہ عوامی چین ہی تھا جس نے جنگ اور اس کے بعد سب سے زیادہ ہماری مدد کی تھی۔ پیر صاحب نے بھارت کی جنگی طاقت کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا تاکہ پاکستانی عوام اپنے دشمن سے خائف ہو جائیں اور یوں ایوب خان کی بزدلی پر پردہ پڑ جائے۔ اب یہی پیر صاحب ہمیں بتانے چلے ہیں کہ قوم اور ملک کا مفاد اسلامی سوشلزم میں نہیں۔ عوام کے دشمن جس قدر اسلامی سوشلزم کی مخالفت کرتے ہیں عوام کو اتنا ہی یقین آجاتا ہے کہ یہی نظریہ ان کے مسائل کا حل ہے۔

"خان"۔ ایم بی بی ایس فائنل —— پشاور

وُہ نظریۂ پاکستان کے نہیں مُلوکیت کے محافظ ہیں

موُدودی صاحب آج کل نظریۂ پاکستان کے خود ساختہ محافظ بنے ہُوئے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا نظریۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان میں کوئی تضاد تھا۔ مودودی صاحب نے تو تحریکِ پاکستان میں مسلم لیگ اور قائدِ اعظم کی عملی مخالفت کی تھی، پھر وہ نظریۂ پاکستان کے کہاں سے حامی ہوگئے۔ یہ تو اُسی طرح کی منافقت ہے جو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کا دتیرہ تھی۔ وہ منہ سے تو اسلام اسلام پکارتے تھے لیکن جب جہاد کا وقت آتا تھا تو دبک کر بیٹھ جاتے تھے۔ مودودی صاحب کے رویّے کے بالکل برعکس ذوالفقار علی بھٹّو کا رویّہ ہے۔ مودودی صاحب تو بڑھاپے تک تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتے رہے اور بھٹّو صاحب بچپن ہی سے اس تحریک کے ساتھ تھے۔ اپنی کتاب "عوام کی عدالت" میں اُنہوں نے قائدِ اعظم کے نام اپنا جو خط شائع کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ سکول کے زمانے سے ہی بھٹّو میں مجاہدانہ صفات تھیں۔ اب جس شخص نے قائدِ اعظم اور تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا ہو ہم اس کو نظریۂ پاکستان کا محافظ سمجھیں یا اُس کو جس نے ان کی مخالفت کی ہو۔ نظریۂ پاکستان کی حفاظت عمل سے ہوگی اور عمل کی توفیق خدا نے مودودی صاحب کو نہیں دی۔ اُن کے حصّے میں تو سوادِ اعظم سے دشمنی ہی آئی ہے جس طرف قوم ہوگی وہ اس سے اُلٹ ہوں گے۔ اصل میں ان کی دوستی مُلوکیت کے اماموں سے ہے، عوام کالانعام کو تو وہ ملوکیت کے قلعے کا اینٹ گارا سمجھتے ہیں۔

ماجدُالدّین — کوہاٹ

عوام خاموش تماشائی نہیں

جو عوام دشمن رہزن بھٹّو صاحب کی مخالفت کر رہے ہیں اور آپ کو دھمکیاں دے رہے ہیں انہیں یہ غلط فہمی ہے کہ مارشل لأ کے دوران عوام اپنے سچّے قائدین کی حمایت سے قاصر رہیں گے اور جب یہ فسطائی ڈنڈا بردار تشدّد کریں گے تو عوام چُوڑیاں پہنے بیٹھے رہیں گے۔ پاکستان کے عوام بے غیرت نہیں۔ گزشتہ سال کی تحریک نے ان میں اہم تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اس وقت جس طرح مزدور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اس سے عوام دشمنوں کی آنکھیں کُھل جانی چاہئیں۔ عوام خاموش تماشائی بن کر بیٹھے نہیں رہ سکتے۔ حالات نے انہیں بے چین کر رکھا ہے۔ جو لوگ ان کے حقوق کے لیے لڑنے والوں پر ہاتھ اُٹھائیں گے عوام اپنی متحدہ قوت اور خدا کے فضل وکرم سے ان کے ہاتھوں کو توڑ دیں گے۔

مُحمّد لطیف۔ طالب علم میونسپل کالج آف کامرس۔ لائلپور

تاتاریوں کی خاطر

مودودی صاحب کی کوشش ہے کہ پاکستان کو عباسیوں کے عہد کا بغداد بنا دیں۔ تاکہ کوئی تاتاری قوم ہم پر چڑھ دوڑے اور وہ پاکستان نعوذ باللہ مٹ جائے جس کی پیدائش کو مودودی صاحب نے ایک درندے کی پیدائش کہا تھا۔ مودودی صاحب نے اِسلام اور کفر کی بحث کو اتنا تیز کر دیا ہے اور اپنے سوا ہر ایک کو کافر گردانے میں ایسا ریکارڈ قائم کر دیا ہے کہ ملک میں یا تو مناظرہ بازی ہو سکتی ہے یا خانہ جنگی۔ اور دونوں حالتوں میں بھارت کے لیے شہ ہوگی کہ تاتاریوں کی طرح ہم پر آچڑھے۔ کہیں مودودی صاحب یہ سب کچھ جان بوجھ کر تو نہیں کر رہے۔

محمّد سلیم بھٹی مُرید۔ فاضلپور۔ راجن پور تحصیل۔ ڈیرہ غازی خان

اداریہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

افراد کو نہیں، پارٹیوں کو ووٹ ڈالے جائیں

جوں جوں انتخابات قریب آتے جا رہے ہیں، انتخابی بخار کی کیفیت اُبھرتی جا رہی ہے لیکن ابھی تک انتخابات کی آئینی بنیاد طے نہیں ہوئی۔ اس لیے عوام کی سطح پر چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں کہ یہ بنیاد کیا ہوگی اور سیاسی جماعتیں بھی مشورے دے رہی ہیں کہ یہ بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ کچھ جماعتوں نے ۵۶ء کے دستور کو امرت دھارے کے طور پر پیش کرنا شروع کر دیا ہے بلکہ انہیں تو اسلام اور پاکستان کی بقا ہی ۵۶ء کے دستور کو اپنانے میں نظر آتی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کے گملے میں بوئے ہوئے اسلام کے پودے کو ۵۶ء کے گلے سڑے دستور کی کھاد میسر نہ آئی تو یہ پودا سوکھ جائے گا اور پھر کسی طور سے بھی ہرا نہ ہو گا۔ کچھ جماعتیں ۵۶ء کے دستور کو اس حد تک منحوس سمجھتی ہیں جیسے یہ کوئی شیطانی منتر ہو کہ جس کا لفظ لفظ عوام کُشی کے مترادف ہو۔ البتہ پاکستان پیپلز پارٹی کا خیال ہے کہ اگر سیاسی جماعتیں باہم مل بیٹھ کر کوئی مشترکہ و متفقہ آئینی بنیاد تلاش کرنے سے قاصر رہیں اور چاہے ان دو باتوں میں ہو کہ ملک میں ۵۶ء کے دستور کے مطابق انتخابات ہو جائیں یا مارشل لا جاری رہے تو ۵۶ء کے دستور میں چند اہم ترمیمات کر کے اسے انتخابات کی آئینی بنیاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ ترمیمیں ون یونٹ کے خاتمے، آبادی کی بنیاد پر نمائندگی اور مرکز اور صوبوں کے اختیارات کے تعین سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہرحال دستوری خلفشار ابھی جاری ہے اور اخبارات کی پیشانیاں بھانت بھانت کی بولیوں سے گونج گرج رہی ہیں۔

حال ہی میں ایک اور اہم مسئلے پر رائے زنی کا آغاز ہُوا ہے۔ کچھ عناصر کی طرف سے مطالبہ ہو رہا ہے کہ ووٹروں کی عمر ۲۱ سال سے گھٹا کر ۱۸ سال کر دی جائے۔ اس مطالبے کو اول اول پاکستان پیپلز پارٹی نے اٹھایا تھا اور اب بھی وہی اس پر مسلسل اصرار کر رہی ہے۔ غیر عوامی جماعتوں نے اس ضمن میں چُپ سادھ رکھی ہے۔ وجہ سیدھی ہے۔ پیپلز پارٹی کو اعتماد ہے کہ ووٹروں کی عمر کم ہو جانے سے جن لاکھوں نوجوانوں خصوصاً طالب علموں کو ووٹ کا حق ملے گا وہ ٹوپی پوش، حُقّہ نوش اور ڈنڈا بردار جماعتوں کے بجائے اُس قوم پرست اور مساوات نواز جماعت کو ووٹ دیں گے جس کی قیادت جوانمرد و شیر دل ذوالفقار علی بھٹو کے ہاتھ میں ہے۔ ہماری دانست میں نوجوان کسے ووٹ دیں گے یہ ثانوی مسئلہ ہے، بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ قوم کے اس سب سے فعال، حساس اور باشعور عنصر کو قوم کے مقدر میں شرکت کا پورا پورا حق ملنا چاہیئے۔ اگر ایک نوجوان اٹھارہ سال کی عمر میں فوج میں بھرتی ہو سکتا اور شادی کر سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ ووٹ کی قدر و قیمت سمجھنے کی اہلیت بھی رکھتا ہے۔ اگر نوجوانوں کو ووٹ سے محروم رکھا گیا تو یہ حالات کا سراسر غلط تجزیہ ہوگا۔ وہ عوامی تحریک جس کے نتیجے میں ایوبی آمریت کا قلع قمع ہُوا اور انتخابی قوت اسّی ہزار بی ڈی برہمنوں کے ہاتھوں سے نکل کر بارہ کروڑ عوام تک آئی نوجوانوں خصوصاً طالب علموں کے جواں خون ہی پر پلی تھی۔ اگر اب بھی نوجوانوں کو غیر ذمہ دار سمجھ کر انہیں ووٹ کی ذمہ داری نہ سونپی گئی تو ان میں مُثبت رجحانات کے بجائے منفی رویّے پروان چڑھنے کا خدشہ ہے اور یوں متوقع سیاسی استحکام محض افسانہ بن کر رہ جائے گا۔

ووٹروں کی عمر گھٹانے کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی زور پکڑ رہا ہے کہ آنے والے انتخابات میں افراد کو نہیں پارٹیوں کو ووٹ ڈالے جائیں۔ گو پاکستان پیپلز پارٹی نے پارٹی کی سطح پر اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا لیکن پارٹی کی مختلف شاخوں سے اکثر اس مطالبے کے حق میں آواز اُٹھ رہی ہے۔ بعض دوسری عوامی جماعتیں طبقاتی بنیادوں پر نمائندگی کا مطالبہ بھی کر رہی ہیں۔ ان کی رائے میں قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں کسانوں کو کسانوں کی آبادی کے تناسب سے اور مزدوروں کو مزدوروں کی آبادی کے تناسب سے نشستیں ملنی چاہیئیں۔ صدیوں سے محنت کش عوام کو جس بُری طرح لوٹا کھسوٹا گیا ہے اور انتخابات کے دوران میں ان سے وعدے کر کے اُونچے طبقوں کے انتخابی پہلوانوں نے ان وعدوں کو جس طرح اپنی خود غرضی اور بدعنوانی کے بتوں کی بھینٹ چڑھایا ہے اس کے پیش نظر یہ مطالبہ بالکل جائز ہے۔ لیکن اس وقت ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ عوام کی سربلندی کے ہر تقاضے کو بلا حیل و حجت پورا

ہفت روزہ نصرت لاہور ۱۶ نومبر ۱۹۶۹ء

کرائیں۔ یہ مطالبہ ایک آئیڈیل تو ہو سکتا ہے لیکن صدر یحییٰ خان کی مارشل لاء حکومت سے یہ توقع رکھنا کہ وہ رجعت پسند سیاسی جماعتوں کو یکسر نظر انداز کر کے یہ سوشلسٹ اصول اپنا لے حقیقت پسندی نہیں کہلا سکتا۔ اس مطالبے کو نظریے کی بلندیوں سے عمل کی زمین پر اتارنے کے لیے عوامی جماعتوں کو طویل جدوجہد کرنی ہو گی۔ اس طرح کے مطالبے مراعات طلبانہ رویّوں سے پورے نہیں ہوا کرتے۔

ہماری دانست میں اس وقت جو بات ممکن اور مستحسن ہے وہ یہی ہے کہ لوگ افراد کے بجائے پارٹیوں کو ووٹ ڈالیں۔ اس طرح ہر سیاسی جماعت کے لیے لازم ہو جائے گا کہ وہ بااثر، دولت مند اور دھاندلی باز انتخابی پہلوانوں کو تلاش کرنے اور انہیں اپنے اپنے زیرِ پا حلقۂ اثر سے کھڑا کرنے کے بجائے اپنے پروگراموں میں عوامی جاذبیت پیدا کرے۔ گویا اس طرح بااثر افراد کے بجائے سارا زور مؤثر پروگرام پر ہو گا اور یہی وہ بات ہے جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

ہمیں احساس ہے کہ انتخابات بذاتِ خود ہمارے قومی اور عوامی مسائل کا حل نہیں۔ انتخابات تو ایک سیاسی عمل کو جنم دیتے ہیں جس سے ملک اور قوم کے مسائل اور ان کے مناسب حل سامنے آتے ہیں اور وہ عوامی قوت آزاد ہوتی ہے جو ان مسائل کے حل کے لیے ایک طاقت ور انجن بن جاتی ہے۔ اگر انتخابی مہم میں افراد کی کامیابی کے بجائے مسائل اور ان کے حل پر زور رہو تو یہ سیاسی عمل وجود میں آ سکتا ہے ورنہ نہیں۔ اور یہ اسی صورت ممکن ہے کہ جماعتیں اپنے پروگرام لے کر عوام میں جائیں نہ کہ ان جماعتوں سے وابستہ جاگیردار اور سرمایہ دار اپنے اپنے حلقۂ اثر کے ووٹوں کو دھن، دھونس اور دھاندلی سے جماعتوں کی جھولی میں لا ڈالیں۔

پارٹی کی بنیاد پر رائے شماری کے ذریعے طبقاتی نمائندگی کے مطالبے کو بھی ایک حد تک پورا کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر عوامی جماعتیں اس بات کا اہتمام کر سکتی ہیں کہ اُن کے حصے میں جتنی نشستیں آئیں وہ اُن کے مقابل کسانوں، مزدوروں، دکانداروں، دانشوروں، طالب علموں اور استادوں کے ترجمانوں کو اسمبلیوں میں بھیجیں — عوام سے محبت کا دعویٰ کرنے والی جماعتوں کے امتحان کا یہ بڑا ہی اچھا موقع ہو گا۔

طبقاتی نمائندگی کی مخالفت میں رجعت پسند جماعتیں مذہب اور روایات کے نام سے طرح طرح کے بہانے تراش سکتی ہیں لیکن پارٹی کی بنیاد پر رائے شماری سے گریز کر کے یہ جماعتیں عوام کی نظروں میں بے نقاب ہو جائیں گی۔ اس طرزِ انتخاب سے وہی پارٹی گریز کرے گی جس کے پاس عوام کے سامنے رکھنے کے لیے کوئی مؤثر، قابلِ اعتماد اور ٹھوس پروگرام نہ ہو گا۔

ہمیں تسلیم ہے کہ مارشل لاء حکومت صدقِ دل سے چاہتی ہے کہ اقتدار عوام کو منتقل کر دیا جائے۔ اس ضمن میں وہ انتخابات کے انعقاد کا انتظام کر رہی ہے۔ ووٹروں کی فہرستیں بن رہی ہیں، آئینی بنیاد مہیا کرنے پر غور و خوض ہو رہا ہے، ون یونٹ کی بابت اعلان ہُوا ہے کہ سب سے پہلے اس "وجۂ نزاع کا فیصلہ کیا جائے گا۔ مختلف جماعتیں بھی انتخابات کو منعقد کرنے پر زور دے رہی ہیں۔ بھوکے ننگے عوام کے غم خوار ایئر مارشل اصغر خان تو اس حد تک انتخابی بخار میں مبتلا ہو چکے ہیں کہ اُنہوں نے ووٹ سے پہلے روٹی مانگنے والوں کو قوم کا دشمن قرار دے دیا ہے۔

بہرحال ہمیں توقع ہے کہ مارشل لاء حکومت عوام کو اقتدار اس لیے نہیں سونپنا چاہتی کہ وہ اقتدار کو سنبھال نہ سکیں گے اور ایک مرتبہ پھر حالات مارشل لاء کا تقاضا کریں گے۔ مارشل لاء حکومت کی یہی خواہش معلوم ہوتی ہے کہ اقتدار عوام کے پاس جائے تو پھر انھی کے پاس رہے۔ ہم حکومت کی خدمت میں صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ خواہش اسی طرح پوری ہو سکتی ہے کہ عوام اپنے ووٹ پارٹیوں کے معاشرتی اور اقتصادی پروگراموں کو دیں نہ کہ مجبوراً انھی لیٹرے طبقات کے افراد کو جن سے گزشتہ ناکام حکومتوں کی اسمبلیاں بھری ہُوئی تھیں۔ اگر حکومت نے پارٹی سسٹم پر رائے شماری کے عوامی مطالبے کو تسلیم کر لیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ عوام کو ووٹ کے ساتھ ساتھ روٹی بھی مل جائے گی۔ کیونکہ اوّلیں مقام سیاسی پارٹیوں کے معاشرتی اور اقتصادی پروگراموں کو حاصل ہو گا نہ کہ ان میں شامل استحصال پیشہ افراد کو۔

اور ایک مرتبہ عوام اپنے قدموں پر کھڑے ہو گئے اور ملک میں عوامی ضروریات کے مطابق معاشرتی اور اقتصادی انقلاب کی داغ بیل پڑ گئی تو عوام کی اجتماعی قوّت انتشار و افتراق کی بلاؤں کو نگل جائے گی اور پاکستان میں عوام کے اتحاد پر مبنی سچّا سیاسی استحکام فروغ پا جائے گا۔

محمد حنیف رامے

حالاتِ حاضرہ ۔ حسین نقی

مزدور اپنے حقوق لے کر رہیں گے

عوامی تحریک کے بعد سے مِل مالکوں اور صنعتکاروں نے مزدوروں کے خلاف منتقمانہ کارروائیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے جس سے ملک کی صنعتی زندگی شدید بحران کا شکار ہو رہی ہے۔

عوامی تحریک کے آخری دنوں میں بائیس سال سے استحصال کی چکی میں پسنے والے مزدور اپنے حالاتِ کار کو بہتر بنانے کے لیے سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ باوجودیکہ زیادہ تر مزدور مل مالکان اور محکمہ لیبر کی دھاندلیوں اور زیادتیوں کی وجہ سے غیر منظم تھے، لیکن عوامی تحریک کے دوران مزدوروں کی فطرتی تنظیمی صلاحیتوں نے وہ کرشمہ کر دکھایا جس کی مثال ہمارے ملک کی تاریخ میں موجود نہیں ہے۔

فیلڈ مارشل ایوب خاں کی آمریت کو ختم کرنے کا سہرا بجا طور پر مزدوروں اور طالبعلموں کے سر بندھتا ہے کیونکہ قوم کے انہی دو حلقوں نے ان سازشوں کو ناکام بنانے کا تاریخی کردار ادا کیا جو سیاسی سودے بازی کے مکروہ ہتھکنڈے استعمال کر کے برسرِاقتدار گروہ اور اقتدار سے محروم سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور نوکرشاہی اور اُن کے ایجنٹوں نے تیار کی تھیں۔

اس بات کو چاہے سرمایہ دار، جاگیردار، نوکرشاہی اور اُس کے ایجنٹ علانیہ تسلیم نہ کریں لیکن مزدوروں، کسانوں، طالب علموں اور ملازمت پیشہ افراد اور دوسرے مفلوک الحال لوگوں کے ساتھ عوامی تحریک کے بعد سے جو سلوک ہو رہا ہے وہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ملکی اقتدار پر قابض طبقات قوم کے فلاکت زدہ طبقوں اور حلقوں کو جدوجہد کی سزا دینے پر تلے ہوئے ہیں۔

نئی حکومت نے مارچ ۶۹ء میں مزدوروں، کسانوں اور طالب علموں کے مسائل کو حل کرنے کا وعدہ کیا تھا، لیکن یہ وعدہ ابھی تک ایفاء نہیں ہوا۔ وجہ یہ ہے کہ صنعتکار سرمایہ دار، جاگیردار اور نوکرشاہی نے ہر اُس کوشش کو ناکام بنا دیا جس کے نتیجے میں گفت و شنید سے قوم کے مختلف طبقات میں کوئی باعزت اور قابلِ عمل معاہدہ عمل میں آتا۔

سرمایہ داروں نے مزدوروں کے ساتھ انصاف پسندانہ رویّہ اختیار کرنے کی راہ میں پہاڑ کھڑے کیے، تعلیم کے ناخداؤں نے اساتذہ اور طلبہ کے خلاف سازش کی۔ دیگر ملازمت پیشہ افراد کے حقوق ان کی انتظامیہ کے ہاتھوں پامال کئے گئے اور کسانوں کے مسائل پر تو اب تک ذرا سی کارروائی بھی نہیں ہو سکی۔ گندم کی قیمت اس وقت پندرہ روپے من رکھی گئی جب چھوٹے زمیندار کاشتکار اُسے اونے پونے بیچنے پر مجبوراً تیار ہوتے ہیں۔ پھر اس قیمت کو بڑھا کر سترہ روپے من اس وقت کیا گیا جب غلہ ذخیرہ اندوز آڑھتیوں اور بڑے بڑے تاجروں کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مشرقی پاکستان میں پٹ سن پیدا کرنے والوں کے ساتھ بھی اُسی قسم کا سلوک جاری ہے، جو سالہا سال سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ مشرقی پاکستان کے کسانوں میں تو تنظیم و تحریک کے آثار ہیں۔ لیکن مغربی پاکستان میں قومی آبادی کا یہ اسّی فیصد حصہ پس ماندگی اور افلاس کے ساتھ ساتھ بے نظمی کا شکار ہے اور تاحال اس طبقے میں تنظیم اور جدوجہد کا کوئی نمایاں اظہار نہیں ہو سکا۔ گویا اب بھی ملک کی قسمت کا فیصلہ شہروں میں ہونا ہے اور شہر میں یہ فریضہ مزدوروں اور طالب علموں اور کسی حد تک دیگر پیشوں سے متعلق افراد ہی کو ادا کرنا ہے۔

آثار اور قرائن یہی بتاتے ہیں کہ پچھلی تحریک کی طرح اس بار بھی عوامی تحریک کے ہراول مزدور اور طلباء ہوں گے۔ البتہ اس بات کا امکان روشن ہے کہ اب کی اوّلین قیادت کا جھنڈا طالب علموں کے بجائے مزدوروں کے ہاتھ میں ہوگا۔

اگر یہ کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ مزدوروں نے ایک نئی ملک گیر تحریک کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ اس کی ابتداء مشرقی پاکستان سے ہوئی، جہاں ٹونگی اور ڈھاکہ وغیرہ کے صنعتی علاقوں میں مزدوروں نے مل مالکان کی منتقمانہ کارروائیوں اور عوامی تحریک کے دوران کیے ہوئے معاہدوں سے پھر کر اشتعال انگیزی کی صورت پیدا کی اور جس کا نتیجہ ہڑتالوں کی صورت میں برآمد ہوا۔ تقریباً اُسی وقت لاہور میں بائیس بڑے سرمایہ دار گھرانوں میں سے ایک یعنی واجد علی فیملی نے پیکیجز کے مزدور نمائندوں کو ٹریڈ یونین سرگرمیوں کے پیشِ نظر برطرف کر دیا۔ پھر بائیس خاندانوں کی ایک بڑی فیملی یعنی کراچی کی ولیکا فیملی نے مزدوروں اور ان کے نمائندوں کے خلاف منتقمانہ کارروائیوں کا سلسلہ شروع کیا۔

واجد علی فیملی کے واجد علی صاحب مُلک کے اُن اوّلین صنعتکاروں میں سے ہیں جو برملا یہ کہتے رہے ہیں کہ ان کی فیکٹریوں میں کوئی مزدور یونین نہیں بن سکتی۔ ولیکا فیملی پاکٹ یونین بنانے میں مہارت رکھتی ہے اور غنڈے پالنا اور ان سے یونین تڑوانا اور مزدوروں کو زدوکوب کروا کر دہشت زدہ رکھنا ہمارے ان صنعتکاروں کا محبوب مشغلہ ہے۔

بڑے سرمایہ دار اور صنعتکار جنہوں نے اس ملک کے عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا جس کا کچھ ثبوت ان گوشواروں اور جرمانوں سے بھی ہوتا ہے جو ان کو پچھلے مہینوں میں بھرنے پڑے، اس بات کے لیے قطعاً تیار نہیں کہ وہ مزدوروں اور محنت کشوں کو باعزت و بافراغت زندگی گذارنے کے لئے تو کجا، ان کو محض زندہ رہنے کے لیے بھی مناسب اُجرت اور سہولیات دیں۔

یہ بات اب کسی سے بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بڑے سرمایہ داروں نے قومی سرمایے پر ناجائز طریقوں سے قابض ہو کر نہ صرف مزدوروں بلکہ انتظامیہ اور حکومت کو بھی بلیک میل کیا ہے۔ باخبر حلقے ان حقائق سے بھی واقف ہیں کہ سرمایہ داروں نے قومی سرمایے کا کافی حصہ ملک سے باہر بھیجا ہوا ہے اور جس علاقے میں مزدور باشعور اور منظم ہیں وہاں سے بھی وہ سرمایہ دوسری محفوظ جگہوں پر منتقل کرتے رہے ہیں اور کر رہے ہیں۔ اس ملک کی معاشیات

کے عام طالب علم بھی اس حقیقت سے واقف ہیں کہ پاکستانی صنعتکار منافع کی غیر معمولی شرح حاصل کرتے ہیں اور بار بار اشیاء صرف کی مصنوعی قلت پیدا کر کے قیمتیں بڑھاتے اور منافع لوٹتے ہیں۔

یہ ناقابل تردید حقیقت بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ پچھلی عوامی تحریک سے اب تک دو سے پانچ فیصد افراد کی اُجرتوں میں جو معمولی اضافہ ہوا ہے اس سے صنعتکاروں کی آمدنی پر کوئی خاص فرق نہیں پڑا اور ان کے خرچ میں زیادہ سے زیادہ پانچ فیصد اضافہ ہوا ہوگا۔ لیکن ملک بھر کی آبادی کو پچھلے پانچ مہینوں میں اشیاء صرف کی قیمتیں تیس فیصد سے لے کر ساٹھ فیصد زیادہ ادا کرنی پڑی ہیں جن کی تمام ذمہ داری سرمایہ دار طبقے پر عائد ہوتی ہے۔

اس گرانی کا شکار مزدور سب سے زیادہ ہیں کیونکہ انھیں اپنی قربانیوں کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا تھا اس سے کئی گنا زیادہ انہیں گراں اشیاء خرید کر واپس سرمایہ داروں کی جیبوں میں ڈالنا پڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ مزدوروں کو اپنے لوٹے جانے کا زیادہ احساس ہے اور لوٹنے والوں کی سازشوں کا بھی انہیں زیادہ قریبی طور پر علم ہے۔ اس صورتحال کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مزدور افلاس، تنگدستی اور استحصال کے نتیجے میں مایوسی کا شکار ہو رہے ہیں اور اس بات پر مجبور ہیں کہ اپنی بدحالی کو دُور کرنے کے لیے عملی قدم اُٹھائیں اور پہلے سے بھی زیادہ بڑی قربانیوں اور صبر آزما جدوجہد کی تیاری کریں۔

آج کل ملک کے بڑے بڑے صنعتی علاقوں میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ ڈھاکہ ہو، کراچی ہو، یا لاہور سب جگہ صنعتی مزدور بےچینی کا شکار ہیں اور صنعتکار ان پر عرصہ حیات تنگ کئے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں صنعتی تعلقات کا جو قانون نافذ ہوا۔ وہ بھی مزدوروں کی اشک شوئی کرنے میں ناکام رہا ہے۔ کیونکہ اس میں ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کی دادرسی کا کوئی بندوبست ہونے کے بجائے دونوں کو زیادہ سے زیادہ ایک سطح پر لا کھڑا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ آجروں کی سازش اور بڑے سرمایہ داروں کی بلیک میلنگ کا نتیجہ ہے۔ اس کا عملی ثبوت یوں بھی فراہم ہوتا ہے کہ لاہور میں بعض صنعتکاروں نے اپنی فیکٹریوں میں تالابندی کا اعلان کیا اور سارا زور اس بات پر صرف کیا کہ مزدوروں کی ہڑتال غیر قانونی ہے۔ ظاہر ہے کہ مزدور ایسے قوانین پر مطمئن نہیں ہو سکتے جو ان کے حقوق کے حصول کے لئے آسانی فراہم کرنے کے بجائے ان کے پیروں کی بیڑیاں ثابت ہوں۔ اس کے علاوہ بھی اگر دیکھا جائے تو ہمارے ملک کی ٹریڈ یونین تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ سرمایہ داروں نے قوانین کو کاغذ کے چیتھڑوں سے زیادہ اہمیت نہ دی اور مختلف قوانین کی کمزوریوں سے پیسہ اور طاقت کے بل پر ناجائز فوائد حاصل کیے۔

پھر مل مالکوں نے ایسے قانون نافذ ہونے تو کجا بننے بھی نہیں دیے جن کے نتیجے میں مزدوروں کو بہتر حالات کار فراہم ہو سکتے۔ اب اگر وہ کسی قانون کا سہارا لینے کی کوشش کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ مزدور انھیں یہ بیساکھی فراہم نہ ہونے دیں گے۔

لاہور میں دو بڑے صنعتی اداروں یعنی پیکیجز اور یونائیٹڈ کیمیکلز کے مزدوروں اور سرمایہ داروں کے درمیان کشمکش جاری ہے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف کارخانوں میں مزدور، صنعتکاروں کی دھاندلیوں کے خلاف برسرِپیکار ہیں۔ ان صنعتی اداروں میں مزدور مناسب اُجرت، بونس، اپنے لیڈروں کی ملازمتوں پر بحالی وغیرہ کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پیکیجز کے مزدور بار بار مالکان کی جانب سے غنڈہ گردی کا الزام لگا رہے ہیں۔ ادھر مالکان یہ رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ ہڑتال غیر قانونی ہے۔ مالکان نے تالابندی کا بھی اعلان کر دیا ہے۔ غنڈوں کے الزام کی تردید مالکان یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ انہوں نے کارخانے کے دفاع کے لیے حفاظتی عملے میں اضافہ کیا ہے۔ جن ٹریڈ یونین عہدیداروں کو مالکان نے نکالا ہوا ہے ان کے لئے انتظامیہ کا یہ بہانہ ہے کہ انھیں مختلف "جرموں" کے پیش نظر برخاست کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ سابقہ صورتِ حال موجود نہیں ہے کہ ان مالکان کی ان دھاندلیوں کے آگے مزدور گھٹنے ٹیک دیں۔ مزدوروں نے اپنی ہڑتال جاری رکھی ہے اور دوسری صنعتوں کے مزدوروں نے بھی دس نومبر کو اپنے بھائیوں کی حمایت میں علامتی ہڑتال کی ہے۔ ۵۲ ہزار سے زیادہ مزدور اس علامتی ہڑتال میں شامل ہوئے اور دیگر مزدور تنظیموں نے ہڑتالی مزدوروں کی عملی معاونت کا اعلان کیا۔ یہ صورتِ حال مزدور تحریک کے لیے انتہائی حوصلہ افزا ہے کیونکہ یہ مزدور طبقے میں اجتماعی شعور کے اضافے کی علامت ہے۔ اس کا ایک مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ یونائیٹڈ کیمیکلز کے مزدوروں کو ایک ماہ کا فوری بونس دیئے جانے کا فیصلہ ہوا ہے۔ اور دیگر شکایات کے سلسلے میں مالکوں نے مصالحانہ انداز اختیار کیا ہے۔ البتہ پیکیجز لمیٹڈ کی انتظامیہ تادم تحریر اپنی ہٹ دھرمی سے باز آتی نظر نہیں آتی اور وہ مزدوروں کی قوت برداشت کا امتحان لینا چاہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہتھکنڈے اب کام نہیں آ سکتے۔ اگر پیکیجز کے مالکوں نے جن میں وہ حضرت بھی شامل ہیں جو اس بات کے دعویدار ہیں کہ ان کے اداروں میں یونین نہیں بن سکتی، اپنی ضد برقرار رکھیں گے تو صورتِ حال اور زیادہ خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔

ان ہڑتالوں اور ان میں دوسرے مزدوروں کی شمولیت سے مل مالکان اور سرمایہ داروں کی آنکھیں کھل جانی چاہئیں اور انھیں اس وسیع تر "معاہدے" کے لئے تیاری کرنی چاہئے جو موجودہ حالات کا تقاضا ہے۔ اگر سرمایہ داروں بالخصوص بائیس خاندانوں نے اپنی روش نہ بدلی تو پھر اُن کو اُس ملک گیر ہڑتال اور اُسی سے پیدا ہونے والے نتائج کی ذمہ داری قبول کرنی ہوگی جس کے خدشے کا اظہار تمام مقتدر ٹریڈ یونین لیڈروں نے اپنی حالیہ تقاریر اور پریس کانفرنسوں میں کیا ہے۔

برسرِاقتدار طبقوں اور حلقوں کو یہ بھی جاننا چاہیئے کہ اس وقت شروع ہونے والی مزدور تحریک قوم کے بیشتر حصے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی کیونکہ ملک کی ۹۵ فیصد آبادی کمر توڑ گرانی، اقتصادی استحصال، اجرتوں کی کمی، حالات کار کی زبوں حالی اور غذا، کپڑے، صحت، تعلیم اور دیگر ضروریات کی عدم فراہمی سے انتہائی غیر مطمئن ہے۔

ہفت روزہ نصرت کا سالانہ چندہ ۱۵ روپے
ششماہی، ۸ روپے سہ ماہی چار روپے ۵۰ پیسے

چاند بک [illegible] سنٹر
بک اسٹال اینڈ لائبریری
بالمقابل لسبیلہ مارکیٹ کراچی

مولانا محمد شاہد

جماعت اسلامی کا اسلامی نظام معیشت

جب سے پاکستان کے غریب عوام نے اسلامی سوشلزم کی آواز پر لبیک کہنا شروع کیا ہے جماعت اسلامی کے سینے پر سانپ لوٹنے لگے ہیں اور وہ ان غریب عوام کو اپنے دام فریب میں پھنسانے کے لیے خود ساختہ "اسلامی نظام معیشت" کے نعرے اونچی آواز سے لگانے لگی ہے اور ان کو باور کرانے کی کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ اس نظام کے اختیار کرنے سے آناً فاناً ان کے زمین و آسمان بدل جائیں گے۔ لیکن جب بھی آپ ان نعرے لگانے والوں سے یہ دریافت کریں گے کہ آپ کا یہ "اسلامی نظام معیشت" کیا چیز ہے تو آپ کو جواب ملے گا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، جماعت اسلامی نے تو اس موضوع پر لٹریچر کا انبار لگا دیا ہے۔" اب اگر آپ میں ہمت ہے تو آپ ان کے خود ساختہ "اسلامی نظام معیشت" کی تفصیلات معلوم کرنے کے لیے چالیس پچاس روپے خرچ کر کے پورا نصف سال اس کا مطالعہ کیجیے۔

تاہم جسے حق بات معلوم کرنے کی لگن ہوتی ہے تو وہ اس "الماری توڑ لٹریچر" کا بھی مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن جب اتنا بڑا پہاڑ کھودنے کے بعد بھی اس کے ہاتھ ایک مردہ چوہا ہی آئے تو اس شخص کی مایوسی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ جماعت اسلامی کے "اسلامی نظام معیشت" کی یہ مایوس کن تفصیلات بڑی طول طویل ہیں اور ان کو بیان کرنے کے لیے خاصی فرصت کی ضرورت ہے۔ لیکن ان کے اس نظام کی جھلک دکھانے کے لیے اگر اس کی بنیاد کی کچھ تفصیلات قارئین کے سامنے لائی جائیں تو وہ بڑی آسانی سے یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس بنیاد پر جو عمارت تعمیر کی جائے گی وہ کیسی ہوگی۔

اسلامی معاشیات پر انقلابی کتابیں

ابھی حال ہی میں جماعت اسلامی کے اشاعتی ادارے اسلامک پبلیکیشنز کی جانب سے جماعت اسلامی ہند کے ایک اہل علم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی اسلامی معاشیات پر چار کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ جن کے متعلق اشتہارات میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہ اسلامی معاشیات پر انقلابی کتابیں ہیں۔ ان میں سے ایک مستقل کتاب ان کے اس نظام کی بنیاد یعنی مضاربت کے موضوع پر ہے جس پر ان کے خیال کے مطابق اسلامی نظام معیشت استوار ہے۔ اس کتاب کا نام ہے "شراکت و مضاربت کے شرعی اصول"۔ مضاربت کو یہ حضرات اسلامی نظام معیشت کی بنیاد اس لیے قرار رہے ہیں کہ در اصل وہ اس کے ذریعے موجودہ بنکاری نظام کو "مسلمان" بنا کر سرمایہ داری نظام کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی صاحب سے پہلے جماعت اسلامی کے "دو ماہرین اسلامی معیشت" اس نظام کی تفصیلات پر مشتمل کوئی نصف درجن کتابیں قوم کی خدمت میں پیش کر چکے تھے۔ ان میں سے ایک تو امیر جماعت اسلامی مولانا مودودی صاحب ہیں۔ جماعت اسلامی کی جانب سے جن کا تعارف "مفکر اسلام" کے طور پر کرایا جاتا ہے اور دوسرے مولانا نعیم صدیقی صاحب ہیں جو جماعت کی نمبر دو نہیں تو ایک مقتدر شخصیت ضرور ہیں۔ آئندہ سطور میں ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ جماعت اسلامی کے ان قدیم و جدید ماہرین معیشت اسلامی نے اپنے بیان کردہ اسلامی نظام معیشت کی "بنیاد" یعنی "مضاربت" کو خود کس طرح سمجھا اور سمجھایا ہے اور یہ کہ ہمارے ائمہ فقہ اس کی بابت کیا فرماتے ہیں۔

مفکر اسلام اور مضاربت کی تعریف

لیجیے پہلے مضاربت کی وہ تعریف سنیے جو جماعت اسلامی کے مفکر اسلام نے بیان فرمائی ہے۔ وہ اپنی مشہور تصنیف "سود" جدید ایڈیشن کے صفحہ ۲۰۶ پر فرماتے ہیں:

> "اگر وہ اپنی پس انداز کردہ رقموں کو کسی نفع آور کام میں لگانے کے خواہشمند ہیں تو ان کے لیے اس چیز کے حصول کا صرف ایک راستہ کھلا ہوگا۔ یہ کہ اپنی بچائی ہوئی رقموں کو مضاربت (یعنی نفع و نقصان میں مناسب شرکت) کے حصول پر نفع بخش کاموں میں لگائیں خواہ حکومت کے توسط سے یا بینکوں کے توسط سے"۔

اس کتاب کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں اس لیے ہم نے احتیاطاً ان کا تقابل کر کے دیکھا، ہر جگہ مولانا نے یہی تعریف فرمائی ہے یعنی نفع و نقصان میں شرکت۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دوسری تصنیفات میں بھی جہاں کہیں اس بنیاد کا ذکر فرمایا ہے وہاں بھی یہی تعریف فرمائی ہے۔ مثلاً ان کی تصنیف "مسئلہ ملکیت زمین" کے صفحہ ۵۸ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "اسلامی قانون نے تجارت، صنعت اور معاشی کاروبار کے تمام شعبوں میں آدمی کو اس بات کی کھلی اجازت دی ہے کہ وہ نفع و نقصان کی شرکت کے اصول پر دوسروں کے ساتھ مضاربت کا معاملہ کرے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو روپیہ دے سکتا ہے اور طے کر سکتا ہے کہ اس سے کاروبار کر کے نفع و نقصان میں آدھے یا چوتھائی کا شریک ہو۔"

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ ان عبارتوں کو خاص طور پر ذہن میں رکھیں جنہیں ہم نے خط کشیدہ کر دیا ہے۔

معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل اور مضاربت کی تعریف

اب جماعت اسلامی کے نمبر دو ماہرِ معاشیاتِ اسلامی مولانا نعیم صدیقی صاحب سے ملیے کہ وہ اپنے اس اسلامی نظامِ معیشت کی "بنیاد" یعنی "مضاربت" کی کیا تفصیلات پیش فرماتے ہیں۔ وہ اپنی ایک عجیب الخلقت تصنیف "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" جو بے چاری اب کافی عرصے سے زیرِ زمین چلی گئی ہے، کے صفحہ ۱۳۷ پر مضاربت کی یہ جامع و مانع تعریف فرماتے ہیں:۔

"اُصول مضاربت کے معنی حصہ داری نفع و نقصان کے ہیں"۔

مولانا نعیم صدیقی صاحب کی کتاب کو جو ہم نے عجیب الخلقت کہا ہے تو اس کے پیچھے ایک بڑی ہی دلچسپ داستان ہے۔ یہ کتاب پہلے "کمیونزم یا اسلام" کے نام سے چھپی تھی۔ بعد میں کچھ ترمیم و اضافہ کر کے اسے "معاشی ناہمواریوں کا اسلامی حل" کا نام دے دیا گیا۔ اس کتاب میں جن بعض اصولوں کو کمیونزم کی طرف منسوب کر کے ان کی برائی کی گئی تھی انھیں بعد میں خود بنفسِ نفیس ماہنامہ چراغِ راہ کراچی کے "سوشلزم نمبر" میں "اسلام کا میزانی نظریۂ معیشت" قرار دے کر یہ دعویٰ فرمایا گیا کہ یہ نظریہ موجودہ اقتصادی گرداب سے واحد نجات کا راستہ ہے!

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ ہم جماعت اسلامی کے اسلامی نظامِ معیشت کی "بنیاد" یعنی مضاربت کی تفصیلات نقل کر رہے تھے۔ جماعت اسلامی کے مفکرِ اسلام اور ماہرِ معیشت نے جب مضاربت کی یہ تعریف کر دی کہ یہ نفع و نقصان میں شرکت ہے تو پھر یہ گردان چلتی ہی گئی۔ جماعت اسلامی کا جو رسالہ یا کتابچہ دیکھیے اس میں یہی تعریف ملے گی۔ مثال کے طور پر ہم ایک اور اہم مقالے "اسلامی معیشت میں بنک اور بچتیں" جو ماہنامہ چراغ راہ کے مئی جون ۱۹۶۵ء کے شمارے میں شائع ہوا، کو لیتے ہیں۔ اس کو ہم نے اہم اس لیے چُنا ہے کہ جماعت کے حلقوں نے اس مضمون کی خوب تعریف کی تھی اور شاید یہ کتابچے کی صورت میں بھی چھپا تھا۔ اس میں بھی مضاربت کا وہی مفہوم یعنی نفع و نقصان میں شرکت بتایا گیا ہے۔

ایک عملی مثال سے وضاحت

کسی اصطلاح کی تعریف ایک فنی چیز ہوتی ہے اس لیے قارئین کو سمجھانے کے لیے ہم اس کی وضاحت ایک عملی مثال سے کرتے جائیں گے۔ مثلاً ایک غریب آدمی اپنی تنگدستی سے مجبور ہو کر کسی سرمایہ دار سے ایک ہزار روپیہ مضاربت کے اصول پر کاروبار کرنے کے لیے حاصل کرتا ہے۔ اس روپے کے ذریعے وہ سال بھر کاروبار کرتا ہے لیکن شومئی قسمت سے اسے دو سو کا خسارہ اٹھانا پڑتا ہے۔ تو اب مضاربت کی جو تعریف مفکرِ اسلام اور ماہرینِ قانونِ اسلامی کی زبانی اوپر گذر چکی ہے اس کی رُو سے ایک سو کا خسارہ سرمایہ دار کے ذمے پڑے گا اور ایک سو کا خسارہ وہ غریب کارکن برداشت کرے گا جس نے اپنی غربت سے مجبور ہو کر مضاربت پر سرمایہ حاصل کیا تھا۔

مضاربت کی ایک اور تعریف

اب آگے چلیے اور جماعت اسلامی کے جدید ماہر معاشیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کی خاص اس موضوع پر مستقل تصنیف کے ورق الٹیے۔ انھوں نے شرکت اور مضاربت کو اس طرح ملا جُلا دیا ہے کہ شاید یہ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ حالانکہ ان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ان دونوں اصطلاحوں کو ایک خاص مقصد کے لیے گڈمڈ کیا ہے اس ملاوٹ کی وجہ سے مضاربت کا واضح مفہوم بھی شرکت کے نیچے دب کر رہ گیا ہے۔ تاہم ان کی کتاب کے صفحہ ۲۸ پر کسی اور ضمن میں ہمیں ان کی ایک عبارت مل گئی جس سے مضاربت کا علیحدہ مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں: "یہ ایک معاہدہ ہے جو کاروبار کرنے والے فریق کے ساتھ سرمایے کا مالک کاروبار کے نفع میں ایک متعین نسبت کے ساتھ شرکت کے عوض کرتا ہے۔ نقصان سے کاروباری فریق کا کوئی تعلق نہیں۔" (شرکت و مضاربت کے شرعی اصول)

ڈاکٹر صاحب کی تعریف کا عملی مثال پر انطباق

مضاربت کے اصطلاحی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے اوپر ہم نے جس عملی مثال کو لیا ہے اس پر جب ڈاکٹر صاحب کی تعریف کو چسپاں کیا جائے گا تو اس کی صورت کچھ یوں ہوگی کہ دو سو کا پورا خسارہ سرمایہ دار کو برداشت کرنا ہوگا۔ غریب کارندے پر کچھ بھی لازم نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ تعریف ہمارے فقہاء کی تعریف کے کچھ قریب ہے لیکن انھوں نے اور نہ ہی ان کے پہلے ماہرینِ معیشت اسلامی نے یہ بتایا ہے کہ وہ غریب کاروباری شخص جس نے تنگدستی سے مجبور ہو کر ایک ہزار روپیہ مضاربت پر لیا تھا اور پورے سال کے کاروبار کے بعد بدقسمتی سے خسارے میں رہا وہ کھائے گا کہاں سے؟ ڈاکٹر صاحب نے تو اپنی پوری مستقل تصنیف میں اس امر کی طرف کہیں بھول کر بھی اشارہ نہیں کیا۔ خیال رہے کہ مضاربت کے لفظی معنی چلتے پھرتے کاروبار کے ہیں۔ یعنی ایسا کاروبار جس کے لیے کاروباری فریق کو سفر کرنا پڑے۔ اب جو کارندہ کسی کاروبار کے لیے سال بھر چلتا پھرتا رہے گا۔ تو آخر وہ کچھ کھائے پیے گا بھی، لباس بھی پہنے گا اور کہیں رہائش بھی رکھے گا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اس معاملے میں خاموش ہیں!

فقہاء اور مضاربت کی تعریف

اوپر والی تعریفات کی شرعی حیثیت کیا بنتی ہے اس کے لیے ہم ائمہ فقہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ پہلے سنیے کہ ان کے نزدیک مضاربت کی کیا تعریف ہے!

"هِیَ فی اللغة عبارة عن ان یدفع لشخصٌ مالاً لآخرِ لتجرفیه علی اَنْ یکون الربح بینهما عن ماشرط و الخسارة علی صاحب المال" (الفقہ علی المذاہب الاربعة جلد ۳ صفحہ ۴۲)

(ترجمہ) لغت میں مضاربت کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص دوسرے شخص کو تجارت کے لیے اس شرط پر سرمایہ مہیا کرے کہ نفع میں بمطابق شرط شریک ہوں گے لیکن کاروبار کا خسارہ صرف سرمایہ دار کے ذمے ہوگا۔

جیسا کہ ہم ابھی ابھی اشارہ کر چکے ہیں مضاربت اس کاروبار کو کہتے ہیں جو چل پھر کر کیا جائے یعنی جس کے لیے سفر اختیار کرنا پڑے۔ فقہاء نے اس معاملے پر بڑی قیود عائد کی ہیں تاکہ یہ کاروبار محدود حد تک رہے لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے کارکن فریق کے تمام اخراجات مثلاً کھانا، پینا، لباس وغیرہ بھی سرمایہ دار پر ڈالے ہیں۔

کارکن فریق کے اخراجات

امام مدینہ امام مالکؒ فرماتے ہیں :۔

”ونفقة العامل من المال فی سفره من طعامه وكسوبة وما يصلحه بالمعروف بقدر المال“۔ (تنویر الحوالک شرح موطا امام مالک جلد ۲، صفحہ ۸۸) .

(ترجمہ) کاروبار کے سفر کے دوران کارکن فریق کے تمام اخراجات مثلاً کھانا پینا، لباس اور دوسرے معروف اخراجات (مثلاً رہائش وغیرہ) سرمایہ کی مقدار کے لحاظ سے سرمایہ پر ہی ڈالے جائیں گے۔

آج کل کے معیار اخراجات کو سامنے رکھا جائے تو ایک غریب شخص کے لباس، طعام اور دوسرے معروف اخراجات پر کم از کم اسّی نوّے روپے ماہانہ خرچ ہو جاتے ہیں۔ یعنی کم از کم ایک ہزار روپے سالانہ۔ اب ائمۂ فقہ کی ان تصریحات کو سامنے رکھا جائے تو اُوپر والی عملی مثال میں سرمایہ دار کو ایک ہزار دو سو روپے کا خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔

عملی مثال کی پوری تصویر

مضاربت کے مفہوم کو سمجھانے کے لیے ہم نے جس عملی مثال کو لیا تھا اب مضاربت کی مختلف تعریفوں کی رُو سے اس کی تصویر کچھ یوں بنے گی :۔

(۱) مفکر اسلام مودودی صاحب اور نعیم صدیقی صاحب کی تعریف کے مطابق سرمایہ دار کو ایک سو کا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے اور باقی ایک سو کارکن فریق کو۔

(۲) جماعت اسلامی کے نئے ماہر معاشیات سرمایہ دار کے ذمے دو سو کا خسارہ ڈالتے ہیں اور کارندے پر نقصان کا ایک پیسہ بھی نہیں ڈالتے۔

(۳) ائمہ فقہ کی تصریحات کے مطابق سرمایہ دار کا خسارہ ایک ہزار دو سو روپیہ تک پہنچ جاتا ہے۔ یعنی دو سو کا اصل خسارہ اور ایک ہزار روپیہ کارکن کا سال بھر کا خرچہ۔

اب ظاہر ہے کہ ان تینوں صورتوں میں سے صرف وہی تعریف صحیح ہو سکتی ہے جو ائمہ فقہ سے منقول ہے۔ قارئین خیال فرمائیں کہ جماعت اسلامی اپنی جس ہستی کو مفکر اسلام کے نام سے پیش فرماتی ہے انھیں اپنے پیش کردہ اسلامی نظام معیشت کی بنیاد تک کا صحیح علم نہیں ہے۔ پھر اس غلط بنیاد پر جو عمارت اُٹھے گی۔ اس کی بابت کچھ کہنے یا کسی پیشگوئی کی کیا ضرورت رہ جاتی ہے۔

مضاربت کی شرعی حیثیت

یہ تو تھیں مختصر تفصیلات مضاربت کے مفہوم کے بارے میں۔ اب آخر میں ہم یہ دیکھیں گے کہ جس چیز کو جماعت اسلامی والے اپنے ”اسلامی نظام معیشت“ کی بنیاد بنا رہے ہیں اس کی شرعی حیثیت کیا ہے۔ امت مسلمہ کے ائمہ میں سے جن حضرات کی معاشیات پہ گہری نظر تھی ان میں سے امام ابن حزم کا نام سرفہرست آتا ہے۔ آیئے ان سے پوچھیں کہ ”وہ بنیاد“ کی شرعی حیثیت کے متعلق کیا فرماتے ہیں:۔

”قال ابن حزم فی مراتب الاجماع كل ابواب الفقه فيها اصلٌ من الكتاب والسنةِ حاشا القراض فما وجدنا لهٗ اصلاً فيها البتة“۔ (نیل الاوطار۔ شوکانی جلد ۵ ص ۲۸۲)

(ترجمہ) علامہ ابن حزم مراتب الاجماع میں فرماتے ہیں کہ فقہ کے ہر باب کی اصل قرآن و حدیث سے ملتی ہے۔ لیکن ہم نے قرآن و حدیث میں مضاربت کے بارے میں بالکل کوئی اصل نہیں پائی۔“

امام ابن حزم مضاربت کی شرعی حیثیت کو اس لیے مشکوک بتا رہے ہیں کہ اسلام نے صرف محنت کے معاوضے کو جائز قرار دیا ہے جب کہ مضاربت تو سرمایے کا معاوضہ ہے اور یوں وہ ربوا کی تعریف میں آجاتا ہے۔ کاش جماعت اسلامی کے ماہرین معاشیات قرآن کے واضح حکم لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعٰى (سورت النجم آیت ۳۹) پر غور کریں اور سرمایہ داری کو ”مسلمان“ بنانے کی کوشش ترک کر دیں۔ صحیح اسلامی نظامِ حیات صرف سرمایہ داری کے خاتمے سے ہی قائم ہو سکتا ہے!

باجلاس جناب محمد اعظم خان صاحب سول جج درجہ اوّل مردان۔ فضل خان (نابالغ، برفاقت مسماۃ تاج بی بی والدہ خود ساکن باڑی چم تحصیل مردان

بنام

پرویز خان وغیرہ مسئول علیہم۔ درخواست التجارت دعویٰ الحوالہ بید خلی اشتہار بنام پرویز خان پسر۔ ماماں سردار بی۔ عزیزہ۔ دلشادہ۔ ریحانہ نسرین دختران مولوی عبد المنان۔ معراج دین ولد اشرف الدین ساکنان باڑی چم تحصیل مردان بذریعہ حصار عامر ور بکینون ولد درجمیل ساکن الحوڈ تحصیل صوابی۔

مقدمہ عنوان بالا مدعا علیہ بالا کی اطلاع عیابی معمولی طریقہ پر ہونی مشکل ہے۔ لہذا بذریعہ اشتہار ہذا مدعا علیہم کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ بتاریخ ۲۲ ۱۲/۶۹ برائے پیروی مقدمہ خود اصالتاً و وکالتاً حاضر عدالت ہذا ہووے۔ بصورت عدم حاضری کارروائی یکطرفہ عمل میں لائی جاوے گی۔

آج بتاریخ ۲۲ ۱۱/۶۹ بہ ثبت دستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

(دستخط حاکم) (مہر عدالت)

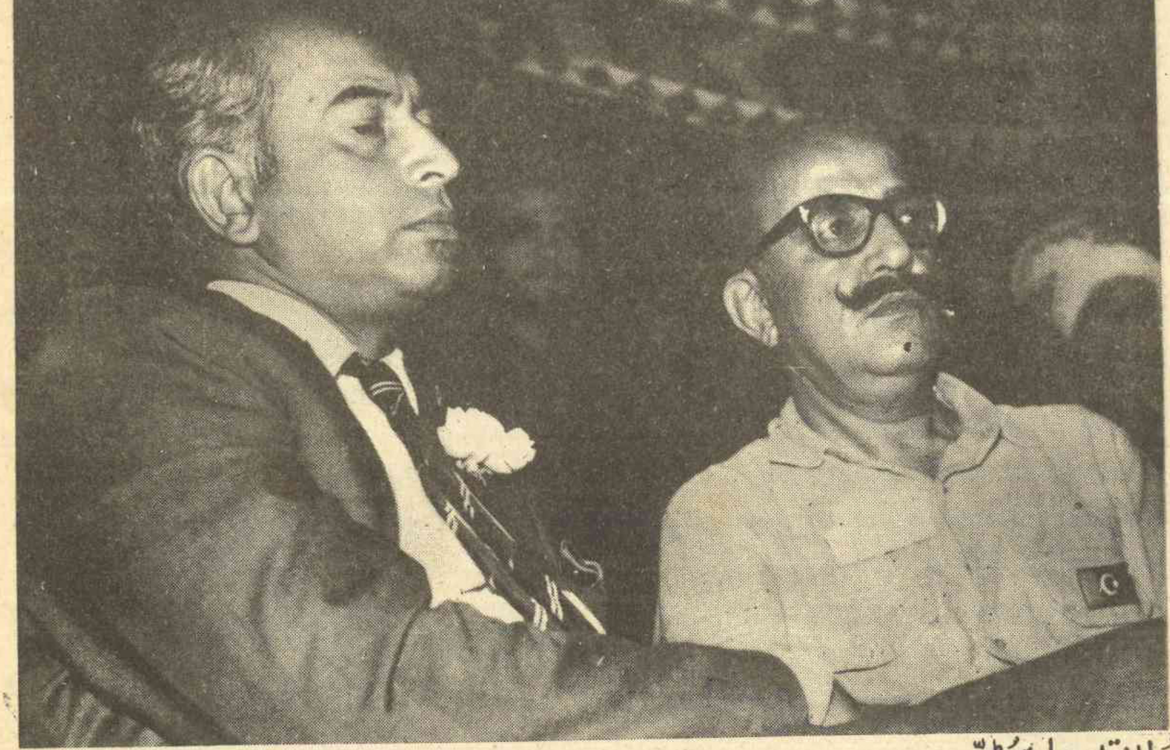

ذوالفقار علی بھٹو

حیدرآباد کنونشن (ستمبر ۱۹۶۸ء) کا خطبۂ صدارت

وہ صورِ اسرافیل جس نے ایوبی 'آمریت کے ایوان پھونک[۷] ڈالے

محترم میر رسول بخش صاحب! وطن کے بہادر کسانو، مزدورو، طالب علمو اور جمہوریت پسند ساتھیو!

سب سے پہلے تو میں پاکستان پیپلز پارٹی (سندھ زون) کے تمام پارٹی کارکنوں کو اس کامیاب کنونشن کے انعقاد پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ کو یقیناً یاد ہوگا کہ گذشتہ سال ۱۸ ستمبر کو میر صاحب کے مکان پر ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے میں نے اعلان کیا تھا کہ میں جلد از جلد ملک میں ایک قومی سیاسی جماعت کے قیام کے لیے جدوجہد کروں گا۔ اس سیاسی جماعت کے قیام کے سلسلے میں میں نے اپنے تمام رفیقوں، دوستوں اور ہمدردوں سے گفت و شنید کی اور مشورے کیے، کیونکہ میں جانتا تھا کہ لاقانونیت اور آمریت کے دور میں کسی قومی جمہوری سیاسی پارٹی کا قیام ایک نہایت ہی مشکل اور کٹھن کام ہے، لیکن آج ہم نے اپنے پُرخلوص کارکنوں کی محنت اور عوام کی پُرجوش تائید سے یہ مشکل اور کٹھن کام بہ حُسن و خُوبی سرانجام دے دیا ہے۔

حضرات! ——— یہ میری خواہش ہے کہ آج میں ان واقعات اور حالات پر روشنی ڈالوں جن کی وجہ سے مجھے اس حکومت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ لیکن میں صرف انہی واقعات اور حالات پر گفتگو کروں گا جن کا بیان کرنا میرے خیال میں ملک و قوم کے مفاد کے لیے نہایت اہم اور ضروری ہے۔ میں صاف اور واضح الفاظ میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ حکومت سے میری علیحدگی اور صدر ایوب خاں سے میرے اختلافات کسی ذاتی منفعت، یا لالچ یا پرمٹ اور لائسنس کے لیے نہیں تھے بلکہ ان اختلافات کی حقیقی بنیاد وہ سیاسی، معاشی اور بین الاقوامی مسائل ہیں جن سے ساری قوم دوچار رہی ہے۔ ان اختلافات کی ابتداء کہاں سے ہوتی ہے، یہ ایک طویل داستان ہے۔ لیکن جنگِ ستمبر کے دوران یہ اختلافات کسی آتش فشاں پہاڑ کی طرح اچانک پھٹ پڑے۔ چنانچہ ایک باشعور قوم کی حیثیت سے آپ کو یاد ہوگا کہ کشمیری عوام کی آزادی ہو یا ہندوستانی توسیع پسندوں سے جنگ و امن کا مسئلہ، اقوام متحدہ کا سوال ہو یا اعلانِ تاشقند، ان تمام اہم مسائل پر میرے اندازِ فکر اور ان کے اندازِ فکر کے درمیان جو فرق اور اختلاف تھا، وہ وقت کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا ——— پھر بھی میں نے صبر کیا ——— لیکن جنگِ ستمبر کے بعد وہ مقام آ گیا جب میں اپنی قوم کی خاطر ان کی اس پالیسی کو برداشت کرنے کو تیار نہ تھا۔ آپ کو بخوبی یاد ہوگا کہ میں اس کٹھن دور میں بھی قومی امنگوں کے مطابق وطنِ عزیز کی سلامتی اور کشمیری عوام کی آزادی کی خاطر ایک ہزار سال تک لڑنے کا اعلان کر رہا تھا۔ دوسری طرف پاکستانی عوام اور مسلح افواج کی بہادری اور استقلال کے باوجود جنگ نے ان کے تمام ارادوں، مقاصد اور موقف کو متزلزل کر دیا تھا۔ حکومت کا رویہ

کمزور تھا۔ اگر اس حکمتِ عملی اور پالیسی پر مزید عمل کیا جاتا تو ملک و قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچتا۔ ان حالات میں، میں مجبور تھا اور میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار بھی نہ تھا کہ اپنے پیارے اور بہادر عوام میں لوٹ آؤں۔ یہی میرے ضمیر کی آواز تھی اور آپ نے دیکھ لیا کہ میں نے ایسا ہی کیا۔

بھائیو! —— میں پاکستان کے دشمنوں کے خلاف آخر دم تک لڑنا چاہتا تھا۔ لیکن میرے جذبۂ حب الوطنی کو میرے مخالفین نے جذباتیت کے نام سے موسوم کیا اور مجھے "جذباتی نوجوان" کے لقب سے یاد کیا۔ "تاشقند" کے بعد میں پاکستان میں جہاں بھی گیا عوام نے محبت اور پیار سے میرا استقبال کیا۔ عوام نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر مجھ سے کیا کیا سوالات نہیں کیے۔ لیکن میں عوام کو کیا بتاتا کہ میرے پیارے وطن اور مجھ پر کیا گزری۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لیے تو میری خاموشی کو بزدلی کا رنگ دیا گیا۔ نہ میں بزدل ہوں اور نہ جذباتی۔ میں تو صرف اس لیے خاموش تھا کہ اس وقت بھی ہمارے دشمنوں کی فوجیں ہماری سرحدوں پر موجود کسی بہتر موقع کی تلاش میں تھیں۔ میں جانتا تھا کہ میری زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ملک میں خانہ جنگی کی آگ لگا سکتا تھا۔ اسی لیے میں خاموش رہا کیونکہ خانہ جنگی سے صرف اور صرف پاکستان کے دشمن کو فائدہ پہنچ سکتا تھا۔ اب میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ خاموش رہنے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب وقت بدل چکا ہے۔ حالات نے نیا رُخ اختیار کر لیا ہے۔ وقت نے ان خطرات کو ٹال دیا ہے جو اُس وقت ملک و قوم کے سر پر منڈلا رہے تھے۔ ویسے بھی اب تک اس دَور کے حالات اور واقعات کے بارے میں دُنیا کے اخبارات اور پریس میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ خاموش رہنے کا ایک وقت ہوتا ہے، ورنہ دنیا میں تاریخ نام کی کوئی شے نہ ہوتی۔ اس لیے اب ایسے تمام واقعات جن کا علم پاکستانی عوام کے لیے ضروری ہے اور ایسے تمام حالات جن کا اظہار اس وقت ملک و قوم کے مفاد میں ہے میرا فرض ہے کہ وہ میں عوام کے سامنے پیش کروں تاکہ وہ ایک واضح اور صاف نقطۂ نظر سے گزشتہ حالات کا تجزیہ کر سکیں اور اصل حقیقت کی نشاندہی کرنے کے قابل ہو سکیں۔ میرے نزدیک یہی وقت کا سب سے بڑا تقاضیٰ ہے۔

حضرات! —— مجھے فخر ہے کہ میں نے سیاسی تربیت پاکستان کے با اخلاق اور محبِ وطن عوام سے حاصل کی ہے۔ عوام ہی میرے حقیقی اُستاد ہیں۔ اس لیے میرے مزاج میں شرافت بھی ہے اور عوامی سیاست بھی۔ بے شک میں نے حکومت کے خلاف سخت اور مدلل تقریریں کی ہیں۔ میں نے حکومت کی پالیسیوں پر شدید نکتہ چینی کی ہے لیکن میں نے سیاست کے میدان میں کبھی حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ میں نے ہمیشہ آدابِ سیاست کا خیال رکھا ہے۔ اسی لیے اب سے پیشتر صدر ایوب خاں کا نام میری زبان پر کبھی نہیں آیا۔ کیونکہ میری سیاست کی بنیاد ذاتیات پر نہیں ہے لیکن میری تعمیری اور صحت مندانہ تنقید سے اگر کوئی فرد یہ سمجھتا ہے کہ میرا اشارہ اس کی ذات کی طرف ہے تو میرا اس میں کیا قصور ہے۔ ویسے یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ آمرانہ نظام میں حکومت اور آمر کے درمیان کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ آمر اور حکومت، دونوں ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ صدر ایوب خان! آپ کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ میں نے آٹھ سال تک اس مُلک کی خدمت کی ہے۔ لیکن پھر بھی آپ میرے ساتھ ناانصافی کرنا چاہتے ہیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن کم از کم اس ملک کے عوام کے ساتھ تو انصاف کریں۔ ان کے سامنے تو غلط بیانی سے کام نہ لیں۔ بہر حال اگر آپ کو عوام کا بھی پاس نہیں ہے تو پھر آپ اور آپ کے حواری وزیر لگا لیں مجھ پر جھوٹے اور بے بنیاد الزامات۔ میں اپنے اور آپ کے معاملے کو عوام پر چھوڑتا ہوں —— وہی اس کا فیصلہ کر دیں گے۔

دوستو اور ساتھیو! —— ایک بار میں جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ اچانک میری ملاقات ہندوستان کے سفیر سے ہو گئی۔ سفیر موصوف نے مجھ سے گزارش کی کہ وہ اُبھرتے ہوئے نئے سیاسی حالات اور واقعات کی روشنی میں، مجھ سے، پاک و ہند کے باہمی تعلقات اور مسائل کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے ہیں۔ اُن کے شدید اصرار پر میں نے اُن کی درخواست قبول کر لی۔ اس ملاقات پر میرے خلاف ہر قسم کے بے بنیاد الزامات عائد کیے گئے تاکہ عوام میں میری مقبولیت کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ میرے خلاف بیانات دیے گئے کہ میں نے چھُپ کر ہندوستان کے سفیر سے ملاقات کی۔ یہ غلط اور بے بنیاد الزام ہے، مجھے چھُپ کر ملنے کی کیا ضرورت ہے۔ عوام جانتے ہیں کہ میں نے کھلے عام ایک بجے دوپہر سفیر موصوف سے ملاقات کی اور پھر چھُپ کر ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ کون نہیں جانتا کہ خفیہ پولیس کے منکر نکیر ہر وقت سایے کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے ہیں —— یاد رکھیے! میں اُن افراد میں سے نہیں جو رات کی تاریکی میں چوری چھُپے پاکستان کے دشمنوں سے مل کر وطن کے خلاف سازشیں کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پاک و ہند کنفیڈریشن بنا دی جائے۔ میں وہی بھٹو ہوں جس کے نظریات و خیالات کو سامراجیوں کے ڈالر تک نہیں خرید سکے تو پھر سفیر موصوف کی چائے کی ایک پیالی میرے پائے استقلال میں کون سی لغزش پیدا کر سکتی تھی۔ میں وہی شخص ہوں جس نے سورن سنگھ جیسے منجھے ہوئے سیاستدان سے سلامتی کونسل میں پنجہ لڑایا تھا اور پاکستان کی عزت پر آنچ نہیں آنے دی تھی۔ میں خوب جانتا ہوں کہ دشمن ملک کے افراد سے کیا اور کس انداز میں گفتگو کرنی چاہیے۔ میں ان افراد میں سے نہیں جو آج کل اس گھناؤنے کام پر مامور ہیں کہ ہندوستان سے دوستی اور تعاون کے عوض کشمیری عوام کی آزادی کا سودا کر لیا جائے۔

حضرات! —— آپ بھی سُن لیجیے —— وہ خفیہ بات چیت کیا تھی۔ سفیر موصوف نے مجھ سے دریافت کیا کہ اگر موجودہ حالات میں دونوں ممالک کے درمیان سیاسی رہنماؤں کے وفود کا تبادلہ کیا جائے تو اس سے پاک و ہند کے باہمی تعلقات بہتر ہونے اور مختلف متنازع فیہ مسائل کے حل میں کوئی مدد مل سکتی ہے؟ —— میں نے صاف الفاظ میں ان کو جواب دیا کہ جب تک ہندوستان اپنے پڑوسی ممالک سے امن و آشتی سے رہنے کے لیے تیار نہیں، جب تک وہ پڑوسی ممالک کے خلاف جارحانہ عزائم اور توسیع پسندی کی حکمت عملی پر گامزن ہے اور جب تک وہ اپنی ہٹ دھرمی کو چھوڑ کر کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کے مطالبے کو تسلیم نہیں کر لیتا اس وقت تک

پاکستان کے عوام کسی بھی مسئلے پر ہندوستان سے بات چیت کرنے کے لیے تیار نہیں اور اگر حکومت پاکستان نے اپنے موقف سے ہٹ کر کمزوری دکھاتے ہوئے آپ کی اس قسم کی کوئی دعوت یا درخواست قبول کر بھی لی تو پاکستان کے عوام کبھی اسے تسلیم نہیں کریں گے۔

بھائیو! —— اب آپ ہی بتلایئے میری اس گفتگو میں آپ کو وطن دشمنی کے جذبات کارفرما نظر آتے ہیں یا وطن دوستی کے —— میرے مخالفین کان کھول کر سن لیں! میرے نظریات و خیالات اتنے کمزور نہیں کہ کسی فرد کے ملنے سے بدل جائیں میں ان افراد میں سے نہیں جن کے خیالات و عقائد جانسن اور ولسن کی ایک ملاقات سے تبدیل ہو جاتے ہیں۔

حضرات! —— پھر اخبارات میں اچانک یہ انکشاف کیا گیا کہ وہ شخص جو ۵۸ء سے اب تک اس ملک میں مختلف شعبوں کا وزیر رہا ہے اور جو ایک عرصے تک پاکستان کا وزیر خارجہ تھا جس کے نام سے اب بھی بھارتی نیتاؤں کو بخار آجاتا ہے وہ ہندوستان کا باشندہ اور شہری ہے —— تم میری قومیت پر شک کرتے ہو؟ تم لوگوں کی طرح دوسرے ممالک میں نہ میری جائداد ہے اور نہ بینک بیلنس اور نہ ہی اپنی قوم سے میں نے کوئی غداری کی ہے کہ عوام کے خوف سے یا دولت کے لالچ میں دوسرے ممالک کی شہریت کی خواہش رکھوں —— اگر آپ کو نہیں معلوم تو سن لیجیے بھٹو کی پیدائش سندھ کی ہے اور مجھے فخر ہے کہ میں پاکستان کا باشندہ ہوں۔ اپنے آباؤ اجداد کی طرح میں بھی یہیں پیدا ہوا اور اسی سرزمین میں دفن ہوں گا —— مجھے اپنے وطن کی مٹی سے پیار ہے۔

بھائیو اور بزرگو! —— آپ کو یاد ہوگا، پچھلے دنوں یوگوسلاویہ میں اقوام متحدہ کے سلسلے میں ایک کانفرنس کا انعقاد کیا گیا تھا۔ یہ کانفرنس اس لیے منعقد کی گئی تھی کہ ادارۂ اقوام متحدہ میں جدید حالات کی روشنی میں اصلاحات کی جائیں تاکہ اس ادارے کو بین الاقوامی امن، آزادی اور اقوام عالم کے باہمی مسائل اور اختلافات کے حل کے سلسلے میں زیادہ مؤثر اور با اثر بنایا جا سکے۔ مجھے بھی اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ اس دعوت نامے پر میرے مخالفین سخت چراغ پا ہوئے۔ میرے خلاف فوراً الزام عائد کیا گیا کہ میں امریکہ کے خرچ پر یورپ کا دورہ کر رہا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس پانچ روزہ کانفرنس کے دوران، دیگر ممالک کے نمائندوں کی طرح میں بھی کانفرنس منعقد کرنے والوں کا مہمان تھا۔ میزبانی کی ذمہ داری ان کا رواجی اور اخلاقی فرض تھا۔ اگر وہ اپنے اس اخلاقی فرض سے عہدہ برآ ہوئے تو اس میں کسی کا کیا قصور؟ حکومت پاکستان سمجھتی ہے کہ اس کانفرنس کا دعوت نامہ قبول کرنا، اس میں شرکت کرنا، حکومت کی پالیسیوں اور موقف کے خلاف ہے۔ یا کوئی جرم ہے تو اسے چاہیے تھا کہ پہلے ہی اس کانفرنس کی مذمت کا اعلان کرتی۔ بہرحال اب بھی وقت نہیں گزرا، وہ اب بھی اس کی مذمت کا اعلان کر سکتی ہے۔ حکومت کو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی قسم کا الزام لگانے سے پیشتر یاد رکھے کہ اس پانچ روزہ کانفرنس کے بعد بھی میں نے تقریباً چھ ہفتے تک یورپ کے مختلف ممالک کا دورہ کیا لیکن یہ دورہ میں نے صرف اپنے روپے پیسے سے کیا اور اپنے تمام اخراجات خود برداشت کیے —— کون نہیں جانتا کہ اس کانفرنس میں نہ صرف پاکستان بلکہ سوویٹ یونین، متحدہ عرب جمہوریہ، عراق، ڈنمارک اور دیگر ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ یہ کانفرنس کسی سامراجی گٹھ جوڑ اور سازش کے لیے منعقد نہیں کی گئی تھی۔ اس کانفرنس میں کیا کچھ ہوا، میں نے اس سلسلے میں کیا اصلاحات اور تجاویز پیش کی تھیں اور کیا تقریر کی وہ سب ریکارڈ پر موجود ہیں —— کیا میں نے تقریر کرتے ہوئے نہیں کہا کہ چین کے ستر کروڑ عوام کو نظر انداز کر کے اور عوامی جمہوریہ چین کو رکنیت دیے بغیر اقوام متحدہ بین الاقوامی امن، آزادی اور بنی نوع انسان کی ترقی اور خوشحالی کے لیے کوئی انقلابی اقدامات نہیں کر سکتی۔ کیا میں نے نہیں کہا کہ اقوام متحدہ کو تمام سامراجی اثرات اور بڑی طاقتوں کے گٹھ جوڑ سے آزاد کیا جائے اور اس سلسلے میں اقوام متحدہ کا ہیڈ کوارٹر نیویارک سے منتقل کر کے کسی غیر جانبدار ملک میں قائم کیا جائے —— کیا میں نے پاکستان کے موقف سے ہٹ کر کوئی بات کی —— کیا میری کوئی بات ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام کی آزادی، سلامتی، خوشحالی اور مفاد کے خلاف ہے۔ کیا امریکہ کے خرچ پہ دورہ کرنے والے اسی قسم کی تقریر کرتے اور تجاویز پیش کرتے ہیں؟ اگر نہیں اور یقیناً نہیں، تو پھر آپ مجھ پر کیسے الزامات لگا سکتے ہیں —— میں اپنے مخالفین کی عقل پر ماتم کرتا ہوں —— ایک طرف آپ راولپنڈی کے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ ہمارے ایک نوجوان وزیر خارجہ نے ایک بڑے ملک (امریکہ) کو ہم سے ناراض کر دیا تھا تو دوسری طرف اس کے بالکل برعکس اعلان کیا جاتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے امریکہ کے خرچ پر یورپ کا دورہ کیا ہے —— میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر ان دو بیانات کے اندر کون سی یکسانیت ہے۔ کیا یہ دونوں بیان ایک دوسرے کی نفی نہیں کرتے؟ —— آسمان پر خاک ڈالنے کی کوشش مت کرو، ورنہ یہ گرد خود تمہارے چہرے کے اوپر آگرے گی۔ پاکستانی عوام خوب جانتے ہیں کہ سامراج صرف اپنے دوستوں اور ایجنٹوں کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ مجھ جیسے سامراج دشمن کے نہیں۔ میں اپنے خرچ پر یورپ گیا تھا۔ مجھے دولت اور روپے کا لالچ نہیں ہے۔ خورد برد تو بڑی بات ہے میں نے وزارت کے دوران کبھی قومی دولت سے ایک کوڑی بھی ناجائز طور پر اپنی ذات کے لیے نہیں لی۔ زرعی اصلاحات کے دوران میرے خاندان نے خوشی سے اپنی چالیس ہزار ایکڑ زمین عوام کے لیے کٹوا دی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ یہ عوام کا حق ہے اور اب میں اعلان کرتا ہوں کہ عوام کی ضرورت کے مطابق میں اپنا سب کچھ ان پر قربان کر دوں گا۔

حکومت آج مجھ پر قومی دولت کے ناجائز استعمال کا بے بنیاد الزام لگا رہی ہے اگر وہ اپنے دعوے میں سچی ہے تو اسے میرا چیلنج ہے کہ مجھ سمیت وہ تمام حضرات جو کبھی اس حکومت سے وابستہ رہے تھے یا اب بھی اس حکومت سے وابستہ ہیں۔ عوام کے سامنے اپنی تمام جائیداد، کاروبار اور مال و دولت کا حساب پیش کریں اور بتائیں کہ وزارت اور صدارت سے پیشتر ان کے پاس کیا کچھ تھا اور وزارت اور صدارت کے

دوران ان کی جائداد، کاروبار اور مال و دولت میں کس قدر اضافہ ہوا یا کمی آئی ہے۔ پھر پتا چلے گا کہ کس کا دامن اس خرد برد سے پاک ہے اور کس کا داغدار ——

صدر صاحب! آیئے، میں اور آپ اس سلسلے میں پہل کریں اور قوم کے سامنے اپنا حساب کتاب صاف کریں —— فرمایئے صدارت سے پہلے آپ کے پاس کیا کچھ تھا اور وزارت سے پہلے میرے پاس کیا کچھ نہ تھا لیکن صدارت کے دوران آپ نے کیا پایا ہے اور وزارت کے دوران میں نے کیا کھویا ہے۔ قوم اس داستان سے بخوبی واقف ہے۔ پھر بھی میں عوام کے سامنے اپنی تمام جائداد اور دولت کا حساب پیش کرنے کے لیے تیار ہوں —— کیا آپ بھی اس کے لیے تیار ہیں؟ دوسروں پر انگلی اٹھانے سے پیشتر بہتر ہے کہ آپ اپنے گریبان میں جھانک لیں۔ مجھے مال و دولت کی ہوس نہیں۔ ورنہ میں بھی ایک عرصے تک صنعت، آئیل، فیول اور امور خارجہ کا وزیر رہا ہوں، اگر اس زمانے میں، میں ایک اشارہ کر دیتا تو میرے پاس بھی دولت کا انبار لگ سکتا تھا۔ لیکن میں نے ایسا نہیں کیا —— اگر میں قوم کو لوٹنا چاہتا تو صدر صاحب! آپ سے زیادہ نہیں تو قریب قریب اتنی رقم میرے پاس بھی ضرور ہوتی۔

حضرات! —— آیئے اب میں آپ کو وہ گفتگو سناتا ہوں جو آخری بار صدر ایوب خاں اور میرے درمیان ہوئی تھی۔ یہ اُن سے میری الوداعی ملاقات تھی۔ شام کا وقت تھا۔ میں ایوانِ صدر کے اس خاص کمرے میں تھا جس کی دیواروں کا رنگ سبز ہے اور جن کے بارے میں مشہور ہے کہ صدر صاحب وہاں اہم مسائل پر گفتگو فرماتے تھے۔ اس سبز کمرے کے بارے میں ایک بار فضل القادر چودھری نے مجھ سے کہا تھا:

"بھٹو! آپ نے اور میں نے وہ کمرہ بھی دیکھ لیا ہے، اب کسی بات کا ڈر اور خوف نہیں ہے" —— اس کمرے میں کیا اہم کام سرانجام پاتے ہیں اور کس قسم کی سیاسی بات چیت کی جاتی ہے، اس کا اندازہ آپ کو میری اور صدر صاحب کی گفتگو سے بخوبی ہو جائے گا۔ صدر صاحب نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے فرمایا:

"دیکھیے اب میری اور آپ کی پالیسی کے درمیان بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے، میں نے آپ کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ ایسی پالیسی سے آپ کو پرہیز کرنا چاہیے جو میری مرضی اور منشاء کے خلاف ہو لیکن آپ میری خواہشات کے خلاف عمل کر رہے ہیں"۔ انھوں نے میز پر پڑے ہوئے "اردو ڈائجسٹ" کی طرف اشارہ کیا جس میں میرا یہ بیان چھپا تھا کہ:

"کشمیری عوام کی آزادی اور حق خودارادیت کے حصول کی خاطر اگر ہمیں دوبارہ ہندوستان سے مقابلہ کرنا پڑا تو ہم ڈٹ کر دشمن کا مقابلہ کریں گے"۔

انہوں نے کہا "یہ سب کچھ کیا ہے؟ آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں آپ کو وزارت سے علیحدہ کر دوں"۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں تو پہلے ہی آپ سے تین بار رخصت کی گذارش کر چکا ہوں۔ یہ صحیح ہے کہ میرے اور آپ کے خیالات اور نظریات کے درمیان بہت بڑا فرق آ چکا ہے۔ اس لیے میں حکومت سے علیحدگی اور رخصت چاہتا ہوں —— اس پر انھوں نے فوراً گفتگو کا رُخ بدل کر فرمایا:

"تم نے ملک و قوم کی بہت خدمت کی ہے۔ میں تمھیں اقتدار سے نہیں گرانا چاہتا۔ میں نے لاڑکانہ میں بھی تم سے یہی کہا تھا"۔

بھائیو! —— میں نے اُن سے کہا کہ میں اپنے خیالات و نظریات چند روزہ اقتدار کے لیے قربان نہیں کر سکتا —— مجھے اقتدار نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے نظریات پیارے ہیں۔ بہتر یہی ہے کہ آپ مجھے حکومت سے رخصت اور چھٹی دے دیں کچھ دیر خاموشی رہی —— پھر فرمایا: "اس طرح تمھیں وزارت سے سبکدوش کیا گیا تو ملک میں اس سے بڑی گڑبڑ اور خلفشار ہو گا۔ تم کچھ روز کے لیے چھٹی پر چلے جاؤ، بعد میں دیکھا جائے گا" —— میں پہلے ہی حکومت سے بیزار بیٹھا تھا میں نے فوراً ان کا یہ فیصلہ قبول کر لیا —— لیکن صدر صاحب نے اس پر بھی بس نہیں کی اور فرمایا: "ایک بات اور یاد رکھو۔ آئندہ کبھی سیاست کی طرف رُخ نہ کرنا" میں ان کی اس دھمکی کو برداشت نہ کر سکا —— میں نے کہا "دنیا کی کوئی طاقت مجھے اپنے عوام سے علیحدہ نہیں کر سکتی ہے۔ اگر کبھی قوم کو میری خدمات کی ضرورت ہوئی اور قوم نے مجھے مدد کے لیے پکارا تو میں ہر قیمت پر اس کی آواز پر لبیک کہوں گا۔ میں سیاست میں حصہ لوں یا نہ لوں اس کا فیصلہ آپ اور میں نہیں کر سکتے۔ اس کا فیصلہ تو عوام کریں گے۔ کیونکہ جو لوگ سیاست کے میدان میں ہوتے ہیں۔ ان کی قسمت کا فیصلہ عوام کی مرضی پر منحصر ہے۔ اگر عوام نے فیصلہ کیا کہ مجھے سیاست میں حصہ لینا چاہیے تو پھر آپ مجھے عوام کی مرضی پر چلنے سے روک نہیں سکتے"۔

میرے پیارے بھائیو! —— انھوں نے میرے اٹل فیصلے کو دیکھ کر مجھے سفارت اور مال و دولت کا لالچ دیا۔ انھوں نے فرمایا "بھٹو! تمھیں جو کچھ چاہیے وہ ہم تمھیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ میں نے انہیں لاڑکانہ کی گفتگو یاد دلاتے ہوئے کہا "صاف سن لیجیے کہ مجھے اقتدار کی ہوس اور عہدوں کی خواہش نہیں ہے۔ میں ایک با اصول انسان ہوں اور اپنے نظریات اور اصولوں کو پامال کر کے حکومت میں شامل رہنے کو تیار نہیں۔ انہی نظریات کی بدولت مجھے اپنے عوام کا پیار ملا ہے، میں ان نظریات کو کسی قیمت پر بھی قربان کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں" —— دوستو! آپ جانتے ہیں، اقتدار آنی جانی چیز ہے۔ اقتدار کبھی سدا کسی کے پاس نہیں رہا۔ سکندر، فرعون، چنگیز خاں اور ہٹلر جیسے مطلق العنان حکمرانوں تک کا اقتدار ختم ہو گیا۔ جو چیز ہمیشہ رہتی ہے اور جو چیز غیر فانی ہے وہ یہ کہ کس نے عوام کی خدمت کی اور ان کے ساتھ عدل و انصاف کیا۔ کس نے قوم پرستی کی اور اپنا سب کچھ عوام پر قربان کر دیا۔ تاریخ کبھی کسی ظالم کو خراج عقیدت پیش نہیں کرتی اور نہ کسی مظلوم اور انسانیت دوست کی قربانی کو نظرانداز کرتی ہے۔ وزیر آتے جاتے رہتے ہیں لیکن قوم صرف ان کو یاد رکھتی ہے جو عوام کی خدمت کرتے ہیں —— فضل الحق نے اسّی سال کی عمر پائی لیکن وہ صرف دو سال وزارت میں رہے۔ قوم نے ان کی مدت وزارت کو نہیں ان کی خدمات کو دیکھ کر شیر بنگال کا خطاب دیا —— قائداعظم نے صرف دو سال پاکستان پر حکومت کی، لیکن عوام اپنے اس محسن کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ قائداعظم نے حکومت، وزارت اور اقتدار کو کبھی اپنے اصولوں پر فوقیت نہیں دی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ کانگرس نے ان سے درخواست کی تھی کہ اگر وہ مطالبۂ پاکستان کو ترک کر دیں تو وہ انھیں متحدہ ہندوستان کا صدر یا وزیر اعظم بنانے کو تیار ہے لیکن قائداعظم نے مطالبۂ پاکستان

کو ترک کرنے کے بجائے وزارت اور صدارت کو ٹھوکر مار دی —— ماؤنٹ بیٹن نے ہندوؤں کے ایماء پر ان سے کہا تھا، آپ برصغیر ہند کو کیوں تقسیم کرواتے ہیں، آپ تقسیم ہند کی بات بھلا دیں تو ہم آپ کو اس ملک کا گورنر جنرل بنانے کو تیار ہیں۔ قائداعظم نے کہا، مجھے گورنر جنرل کا عہدہ نہیں چاہیے، مجھے پاکستان چاہیے۔ یہی وہ بنیادی فرق ہے جو ایک با اصول انسان اور ان لوگوں کے درمیان ہوتا ہے جو اپنے اصول پامال کر کے اقتدار کی ہوس میں کرسیوں سے چمٹے رہتے ہیں۔ جب میں نے ان کی تمام تجاویز ماننے سے انکار کر دیا تو صدر صاحب نے فرمایا:

"بھٹو! تمہارے انداز میں غرور اور تمکنت آ گئی ہے ورنہ تم یوں مجھے جواب نہ دیتے۔ خیر پھر بھی مجھے تمہارے پر رحم آتا ہے۔ تم نے آرام و آسائش میں آنکھ کھولی ہے۔ تم ابھی دکھ تکلیف اور مشکلات سے ناواقف ہو —— یاد رکھو! میں اس ملک کا صدر ہوں تم جانتے ہو، میں اپنے مخالفین سے کیا سلوک کرتا ہوں —— تم کو آخری بار تنبیہ کرتا ہوں، اگر تم نے واپس آ کر سیاست میں حصہ لیا تو میں کو تباہ کر ڈالوں گا۔ یہ مت بھولو کہ تم اسی سندھ کے علاقے سے تعلق رکھتے ہو۔ جہاں کے بڑے بڑے "پیر پگاڑو" کے لیے میرا ایک تحصیل دار اور تھانے دار کافی ہے" ——

میں نے کہا "آپ کی بڑی مہربانی جو آپ نے سندھ اور سندھ کے عوام کی اس قدر تعریف کی لیکن اتنا آپ بھی یاد رکھیے کہ میں رنگ نسل اور علاقائیت کا قائل نہیں ہوں اور میں انگریزوں کے اس فرسودہ فلسفے کو نہیں مانتا کہ رنگ و نسل اور علاقے کی بنیاد پر کوئی قوم بڑی یا چھوٹی ہوتی ہے، بزدل یا بہادر ہوتی ہے۔ میرے نزدیک تو تمام انسان یکساں اور برابر ہیں۔ چاہے کوئی سیاہ فام افریقی ہو یا چینی، جاپانی، چھوٹا ویٹ نامی ہو یا لمبا تڑنگا امریکی —— یہی میری سوچ اور نظریۂ حیات ہے۔ آپ سندھی اور غیر سندھی کی بنیاد پر مجھے ڈرانے اور دبانے کی کوشش نہ کریں۔ آپ ابھی اس ریگستان کے عوام سے ناواقف ہیں، آپ کو کیا حق ہے کہ آپ سندھ کے عوام کو بزدل کہیں۔ اگر آپ تباہ کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تمہیں قبر تک نہیں چھوڑوں گا، تو یہ بھی خیال کریں کہ آخر سب کو قبر ہی میں جانا ہے۔" میرے اس جواب پر فرمایا، "اچھا اب آپ چھٹیاں گزاریں۔ یہ سب کچھ بعد میں دیکھا جائے گا۔"

میرے بھائیو! میں آج مجبوراً تین سال کے بعد یہ تھوڑی بہت باتیں اس لیے بتا رہا ہوں تاکہ آنے والے حالات میں آپ صحیح فیصلہ کر سکیں۔ کیونکہ آئے دن میرے خلاف حکومت کی طرف سے جھوٹے پروپیگنڈے کی مہم چلائی جا رہی ہے۔ اب آپ کو فیصلہ کرنا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر۔ صدر ایوب خاں اور ان کے مشیروں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ میرے خلاف طرح طرح کے مقدمے بھی قائم کر دیے جائیں تاکہ آسانی سے آنے والے انتخابات میں مجھے نااہل قرار دے کر صدر ایوب خاں کے راستے کی ایک بڑی رکاوٹ کو مسمار کر دیا جائے۔

دوستو اور بزرگو! میں بھی انسان ہوں اور مجھ سے بھی غلطی ہو سکتی ہے، لیکن میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر آپ سے کہتا ہوں کہ مجھ سے کوئی ایسا گناہ سرزد نہیں ہوا جس کا یہ لوگ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں۔ میں نے دورانِ وزارت اپنے اختیارات کو بھول کر بھی ناجائز طور پر استعمال نہیں کیا۔ میں نے کبھی قومی دولت کو غلط اور ناجائز طور پر استعمال نہیں کیا —— ہاں مجھ سے ایک گناہ ضرور سرزد ہوا ہے اور وہ صرف یہ ہے کہ آٹھ سال تک میں اس حکومت سے وابستہ رہا ہوں۔ حالانکہ وہاں پر بھی حسبِ مقدور میں نے ملک و قوم کی خدمت کی ہے۔ حکومت کو جب میرے خلاف کوئی ٹھوس مواد نہیں مل سکا تو مجھ پر یہی الزام دھرا گیا کہ میں نے آدھی قیمت دے کر قومی ٹریکٹر استعمال کیے تھے۔ یہ کتنا مضحکہ خیز الزام ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں اس ملک کا وزیر خارجہ ہی نہیں، آئل، فیول اور صنعت کا بھی وزیر رہا ہوں۔ اگر میں چاہتا تو ٹریکٹر کی تو کیا اہمیت ہے دوسرے وزیروں کی طرح میرے پاس بھی ملیں اور فیکٹریاں ہوتیں اور ملک سے باہر میرا بینک بیلنس ہوتا —— لیکن خدا کا کرم ہے، میری نیت ہمیشہ صاف رہی ہے۔ اگر مال و دولت کی ہوس ہوتی تو اسے حاصل کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہ تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ ایک بار دنیا کی ایک بہت بڑی طاقت کے نمائندے نے میرا بازو تھام کر کہا تھا "بھٹو! اگر تم پاکستان میں ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ تو اس کے بدلے میں ہم تمہیں وہ سب کچھ دینے کے لیے تیار ہیں جس کی تم خواہش کرو گے۔" میں نے غصے سے اپنا بازو چھڑا کر اس سامراجی کو جواب دیا تھا "خبردار! جو تم نے پھر کبھی ایسی جرأت کی۔ اگر تم نے چند وطن فروشوں کو خرید لیا ہے تو یہ خیال مت کرو کہ پاکستان میں ہر شخص میر جعفر اور میر صادق ہے۔ میں شعیب نہیں جس نے وطن فروشی کے صلے میں واشنگٹن اور سوئٹزرلینڈ میں روپیہ جمع کر رکھا ہے" ——

جب میں نے واپسی پر صدر صاحب کو یہ قصہ سنایا جو اس وقت سوات میں تھے تو انہوں نے کہا —— "آفرین ہے تم پر ——" کیا یہی ہے وہ آفرین جو آج کل الزامات کی صورت میں دی جا رہی ہے۔ میں نے اس ملک میں چور بازاری، رشوت ستانی، سمگلنگ اور اقربا پروری کی روک تھام اور خاتمے کے لیے بہت کوشش کی ہے لیکن ضمیر فروش ان ذلیل حرکتوں سے باز نہیں آئے کیونکہ خود حکومت کے اندر ان افراد کا ایک مضبوط گروہ موجود ہے۔ جو کچھ اس ملک کے ساتھ ہوا ہے اور ہو رہا ہے وہ ایک دکھ بھری داستان ہے۔ وقت آنے پر میں آپ کو اور بہت کچھ بتاؤں گا اور تمام وطن دشمنوں اور ضمیر فروشوں کو بے نقاب کروں گا۔

بھائیو! —— پاکستان پیپلز پارٹی ایک با اصول نظریاتی جماعت ہے جس کے پیش نظر ایک عظیم نصب العین اور مقصد ہے۔ اس لیے ہم نظریاتی اور اصولی بنیادوں پر حکومت کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ حکمران طبقہ اصول و نظریات پر بات کرنے کے بجائے ذاتیات پر اتر آتا ہے —— جب ہم اصول کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں —— "ٹریکٹر کا مقدمہ قائم کرو" —— جب ہم سوشلزم کی بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں —— "انہیں ڈی پی آر میں بند کرو" —— جب ہم مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان مساوات کا نعرہ لگاتے ہیں تو وہ فرماتے ہیں —— "اگرتلہ سازش کا مقدمہ قائم کرو" —— جب ہم بلوچستان کے عوام کے لیے انصاف کا

مطالبہ کرتے ہیں تو حکم فرماتے ہیں ــ "اکبر بگٹی کو جیل میں ڈال دو" ــ جب ہم کہتے ہیں کہ اسلام ہمارا دین ہے تو وہ کہتے ہیں ــ "اس پر بھی صرف ہماری اجارہ داری ہے" ــ ہم کہتے ہیں عوام جمہوریت چاہتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ــ "اُن کے لیے صرف بنیادی جمہوریت ہی کافی ہے" ــ ہم عوام کے لیے روٹی کپڑا مانگتے ہیں تو وہ کہتے ہیں ــ "انہیں لاٹھی اور گولی دو" ــ

قصّہ مختصر! خاں صاحب! بولیے، ہم نے جمہوریت کو پامال کیا ہے یا آپ نے۔ آپ کی حکمرانی میں ہر طرف ظلم و ستم، بھوک و افلاس اور جہالت کا دَور دَورہ ہے اور عوام پر دفعہ ۱۴۴، ڈیفنس آف پاکستان رُولز اور کالے قوانین کے پہرے ہیں ــ آج درّہ خیبر سے لے کر کراچی تک اور کراچی سے چٹاگانگ تک ہر سمت سے بھوکے کسانوں، ننگے مزدوروں، پُرآتش طالب علموں اور مجبور و محکوم عوام کی فریاد کی آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن ملک میں کوئی دادرسی کرنے والا نہیں۔ اگر حالات یہی رہے تو ایک نہ ایک دن عوام اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ضرور عَلمِ بغاوت بلند کریں گے اور اس ملک میں شدید خانہ جنگی اور خُون خرابہ ہوگا۔ یہ میری پیش گوئی نہیں، یہ تو عام عقل کی بات ہے۔ کہا جائے گا کہ میں بغاوت پھیلا رہا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو یہ بھی کر گزروں گا۔ میں اس سے نہیں ڈرتا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے میں عوامی مسائل کو پُرامن اور جمہوری ذرائع سے حل کرنے کا قائل ہوں۔ لیکن اگر آپ جمہوریت کی زبان ہی سمجھنے سے قاصر ہوں تو بتائیے کہ عوام کے حقوق حاصل کرنے کے لیے ہم کونسا طریقہ اختیار کریں۔ اگر ضرورت پڑی تو سب سے پہلے میں خود میدان میں نکلوں گا۔ ہم انقلاب سے نہیں ڈرتے، ہم خون خرابے سے نہیں ڈرتے۔

خاں صاحب! میں بُزدل نہیں کہ دفعہ ۱۴۴ اور ڈیفنس آف پاکستان رُولز سے ڈر جاؤں ــ میں تمہاری بندوقوں سے بھی نہیں ڈرتا ــ لے آؤ اپنی بندوقیں ــ میرے ساتھ پاکستان کے عوام ہیں جو ایٹم بم سے بھی بڑی طاقت ہیں۔ دیکھ لینا میں جمہوریت اور سوشلزم کے قیام کے لیے اپنے عوام کے ساتھ سر سے کفن باندھ کر نکلوں گا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ میں تو اپنی کشتیاں پہلے ہی جلا چکا ہوں، آپ کا بھی آرام اور چین جائے گا ــ حکومت نے بیس خاندانوں کی خوشنودی کی خاطر، جو عوام کا خُون چُوس رہے ہیں، گیارہ کروڑ عوام کو نظرانداز کر دیا ہے ــ یہ سودا حکومت کو بہت مہنگا پڑے گا۔ قوم کی خاموشی اور مجبوری سے یہ مت سمجھیے کہ یہ قوم بُزدل ہے۔ یہ قوم بزدل نہیں، اس کے نام نہاد لیڈر بُزدل ہیں۔ اس بہادر قوم نے تو اس وقت اپنے سے چار گنا بڑے دشمن کا مقابلہ کیا تھا جب اس کے بڑے بڑے نام نہاد رہنما اور میر کارواں اپنے گھروں میں پریشان اور خوفزدہ بیٹھے تھے۔ اس قوم نے سامراجیوں اور ان کے ہندوستانی دلّالوں کا مقابلہ کیا ہے۔ یہ قوم ہر ظلم و ستم سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہے۔

عزیز ساتھیو! ــ ہر جمہوری اور ترقی پسند ملک کا انتظام اس ملک کے دستور او قانون کے مطابق چلا کرتا ہے۔ اس لیے وہاں انتظامیہ کی یہ اہم ذمہ داری اور فرض ہوا کرتا ہے کہ دستور اور قانون کے مطابق اور اس کی روشنی میں ہر قدم اُٹھائے اور اس ملک کا نظم و نسق چلائے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ہر کام اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ یہاں دستور انتظامیہ کی رہنمائی نہیں کرتا، انتظامیہ دستور کی رہنمائی کرتی ہے۔ یہاں انتظامیہ دستور کے مطابق کام نہیں کرتی، بلکہ دستور انتظامیہ کی مرضی پر چلا کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس ملک سے دستور کی سربراہی اور قانون کی بالادستی اُٹھ جاتی ہے اس ملک سے عدل و انصاف بھی اُٹھ جاتا ہے۔ آج میں اسی طبقے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جسے ہم انتظامیہ، نوکر شاہی، افسر شاہی یا سندھی زبان میں "کامورا شاہی" کے نام سے پکارتے ہیں ــ یہ طبقہ پاکستان میں بہت طاقتور اور خوش و خرّم ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہے اور آج ملک کے سیاہ و سفید کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ انتظامیہ کے اہم فرائض اور ذمہ داریوں کے پیشِ نظر دستور نے انتظامیہ کو مکمل تحفظ عطا کیا ہے تاکہ سیاسی اختلاف اور گٹھ جوڑ سے آزاد رہ کر یہ عوام کی خدمت کر سکے۔ اسی لیے حکمران آتے اور جاتے رہتے ہیں، حکومتیں بنتی اور ختم ہو جاتی ہیں لیکن انتظامیہ برقرار رہتی ہے۔ کیونکہ یہ سیاسی کشمکش سے بے نیاز اور آزاد ہے۔ مگر شرم کا مقام ہے کہ ہماری انتظامیہ صرف حکمرانوں کے سیاسی مقاصد کی تکمیل کا آلۂ کار بن کے رہ گئی ہے ــ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حکومت کے احکامات پر عمل درآمد کرنا اس کا اوّلین فرض ہے۔ لیکن اسے سیاست کی عینک پہن کر حکمرانوں کے ہر جائز اور ناجائز حکم کی تعمیل نہیں کرنی چاہیے۔ پہلے اسے ہر حکم کو دستور اور قانون کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ اگر حکم، دستور اور قانون کے منافی ہے تو اسے ایسے تمام غیر قانونی اور ناجائز احکامات کو بلاخوف و خطر رَد کر دینا چاہیے۔ ڈرنے اور خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ــ مسٹر جے اے رحیم کی مثال کو پیشِ نظر رکھیں۔ اس مجاہد نے اپنے دَورِ ملازمت میں کبھی غیر قانونی اور غیر دستوری احکامات کی بجاآوری نہیں کی ــ حکومت نے رحیم صاحب کی پنشن بند کر دی لیکن پھر بھی وہ حق پرستی سے باز نہیں آتے اور آج وہ ہماری صفوں میں شامل، ہمارے درمیان موجود ہیں۔

انتظامیہ عوام کی محافظ اور خادم ہے۔ لیکن پاکستان میں انتظامیہ کا کام کچھ اور ہے۔ یہاں اس کی اہم ذمہ داری اور فرض یہ ہے کہ وہ حاکموں کا شاندار استقبال کرے۔ دفعہ ۱۴۴ کے باوجود ان کے جلسے اور جلوسوں کا انتظام کرے۔ حاکموں کے لیے زندہ باد اور حزبِ اختلاف کے لیے مُردہ باد کے نعرے لگانے والوں کا کم سے کم ریٹ پہ انتظام کرے۔ وزیروں اور حکمرانوں کی مدح سرائی میں رات دن مشغول رہے۔ مخالف جماعتوں کے جلسے بگاڑے اور ان کے جلوسوں پر لاٹھی چارج کرے ــ غنڈہ عناصر کا تحفظ کرے اور شریفوں کو غنڈہ ایکٹ کے تحت بند کرے۔ فحاشی اور جُوئے کے اڈوں کی سرپرستی کرے اور انتخابات میں حکمران جماعت کے لیے بوگس ووٹوں کا انتظام کرے۔ اس بات کی خبرگیری کرے کہ کہیں جمہوریت، سوشلزم اور آزادی کے نعرے کی آواز نہ اُٹھنے پائے۔

میں اس ملک کی انتظامیہ کو خبردار کرتا ہوں کہ وہ فوراً اپنی غیر دستوری اور غیر جمہوری روش کو بدلے۔ تم کس سے خوف کھاتے ہو؟ —— جو تم سے یہ کہتا ہے کہ تم شخصی حکومت کے ملازم ہو، وہ جھوٹ بولتا ہے —— آپ کسی آمر یا فرد کے زر خرید غلام نہیں ہیں —— آپ صرف عوام کے خادم ہیں، آپ کی تنخواہ کسی آمر کی جیبِ خاص سے ادا نہیں کی جاتی۔ یہ تو عوام کے پیسے اور ٹیکس سے ادا کی جاتی ہے۔ اگر تم کو ڈرنا ہی ہے تو کسی اور سے کیوں، اپنے عوام سے ڈرو۔ اگر نمک حلالی کی بات ہے تو عوام سے نمک حلالی کرو، جن کے پیسے سے تم کو تنخواہ ملتی ہے۔ تم کو چاہیے کہ ہمت اور غیرت سے کام لو۔ اور ان افسروں کے نقشِ قدم پر چلو جو غیر قانونی کام کرنے کے بجائے حکومت کے منہ پر استعفادے مارتے ہیں۔ میں اس ملک کی نوکر شاہی سے کہتا ہوں کہ وہ اپنے اطوار کو بدلے ورنہ سیکشن افسروں سے لے کر سیکرٹریوں تک کے نامۂ اعمال ہمارے ذہنوں میں محفوظ ہیں —— یاد رکھو ایک دن تمھیں عوام کی عدالت کے سامنے جواب دینا ہے ——

میں انتظامیہ کے ظلم و ستم کو کیسے نظرانداز کر سکتا ہوں —— میں اس ظلم و ستم کو کیسے بھول سکتا ہوں جو حیدرآباد کے طالب علموں کے ساتھ کیا گیا —— ظالمو! تم اپنے گناہوں کو نہیں چھپا سکتے۔ دریائے سندھ کا مقدس پانی اور گدو بیراج کے خاموش ستون تمھارے خلاف شہادت دے رہے ہیں کہ کس طرح تم نے بیراج کو چاروں طرف سے گھیر کر نہتے طالب علموں پر لاٹھیاں اور گولیاں برسائیں تم نے گرفتار طلباء پر ہر قسم کے ستم ڈھائے اور انھیں مجبور کیا کہ وہ ذوالفقار علی بھٹو اور حزبِ اختلاف کے دوسرے رہنماؤں کے خلاف بیان دیں کہ انھوں نے طالب علموں کو ہڑتال اور مظاہروں پر اکسایا تھا۔ گرفتار شدہ طلبا نے کہا، تم ہمیں قتل کر ڈالو، لیکن ہم کسی بے گناہ کا نام لینے کے لیے تیار نہیں۔ ہم اپنے مطالبات کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔

علم کے متوالو! —— اگر وہ تم کو اس شرط پر رہا کرنے کے لیے تیار ہیں تو تم بے شک میرا نام لے دو —— ظالموں کے غلامو! ملک کے دشمنو! عوام کے قاتلو! تم کو کیا حق ہے کہ تم آزادی کے شہیدوں کی یادگاریں قائم کرو یا جنگ ستمبر کے بہادروں کی یاد میں مینار بناؤ —— ہم بنائیں گے آزادی کے متوالوں اور جنگ ستمبر کے شہیدوں کی یادگار۔ ہم بنائیں گے سندھ اور حیدرآباد کے طالب علموں کی قربانیوں کی یادگار ——

معراج محمد خان! ہم کراچی میں عوام اور طالب علموں کی قربانیوں کی عظیم الشان یادگار قائم کریں گے —— جنھوں نے اپنا خون دے کر شمعِ علم کو روشن رکھا، جنھوں نے سامراج کی مخالفت، مارشل لاء کے خاتمے، جمہوریت کی بحالی، عوامی حقوق کے تحفظ اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے محکوم عوام کی جدوجہد آزادی میں بار بار لاٹھی اور گولی کا مقابلہ کیا۔ قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور اپنا خون دیا —— ہم بنائیں گے لاہور اور ملتان میں پنجاب کے اُن طالب علموں کا مینار جن کے سینے اعلانِ تاشقند کے خلاف مظاہروں میں چھلنی کیے گئے —— ہم کوئٹہ میں بلوچستان کے عوام اور ان کے رہنماؤں کی یادگار قائم کریں گے جو بلوچستان کے عوام کے حقوق کی خاطر نکلے تھے —— ہم سرحد کے ان علاقوں میں ان غیور پٹھانوں کی یادگار قائم کریں گے جہاں عوام پر آگ برسائی گئی تھی —— ہم مشرقی پاکستان کے طالب علموں، مزدوروں، کسانوں اور عوام کی عظیم جدوجہد جمہوریت کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے وہاں مینارِ جمہوریت قائم کریں گے ——

کراچی میں مہاجرین کے قاتلو! —— مہاجر ابھی وہ تمہارا رقصِ فتح نہیں بھولے جس کی مدہوشی میں تم نے لالوکھیت اور ناظم آباد کے عوام کا قتلِ عام کیا تھا اور ان کی بستیوں کو نذرِ آتش کیا تھا —— تم نے ان مہاجرین کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ جن کی قربانیوں کے بغیر پاکستان کا قیام ناممکن تھا —— آج تم مہاجرین کی دوستی کا دم بھرتے ہو —— یاد رکھو تم نے گزشتہ انتخابات کے دوران انھی مہاجرین کے لیے فرمایا تھا: اگر ہم مہاجرین کو کراچی میں پناہ نہ دیں تو انھیں بحیرۂ عرب میں ڈوبنا پڑے۔ اب تمھارے فرزند پستول لگا کر مہاجرین کے مسائل حل کرنے نکلے ہیں —— گزشتہ انتخابات میں وہ لالوکھیت اور ناظم آباد کے لیے نکلے تھے —— کچھ مسائل پہلے انتخابات کے دوران ان غریبوں کے تم نے حل کیے تھے اب کون سے مسائل حل کرنے نکلے ہو —— ؟

آنے دو انھیں میدان میں، لے آئیں وہ اپنے مال و دولت کو، لے آئیں اپنے لائسنس اور پرمٹ —— لے آئیں اپنی پولیس —— استعمال کرو اپنے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور اخبارات کو —— ہمارے پاس کچھ نہیں، ہمارے ہاتھ خالی ہیں —— تمھارے پاس حکومت اور اقتدار ہے —— مگر یاد رکھو! ہم نے "اقتدار کے کاغذی شیر" کو اچھی طرح اندر سے دیکھا ہے نکل آؤ میدان میں —— ہم دشمن پر سوتے میں حملہ کرنے کے قائل نہیں۔ میں تم کو پہلے سے خبردار کیے دیتا ہوں کہ آنے والے انتخابات میں اس حکومت کا مقابلہ کسی اور سے نہیں عوام سے ہے۔ یہ ماضی کی کوئی پارٹی نہیں۔ یہ محمد شاہ رنگیلے کی فوج نہیں —— آپ کا مقابلہ ایک انقلابی پارٹی سے ہے جو عوامی انقلابی پروگرام سے مسلح ہے۔ اس حکومت کے ہاتھ رشوت ستانی، چور بازاری، لوٹ کھسوٹ، ظلم و ستم اور عوام کے خونِ ناحق سے داغدار ہیں۔ لیکن یاد رکھو ہمارے ہاتھ عوام کے خون سے رنگین نہیں —— ان ہاتھوں میں عوام دوستی نے عظیم قوت بخش دی ہے —— سوچ لو! یہ ہاتھ کسی ظالم کے ہاتھ نہیں —— یہ عوام کے ہاتھ ہیں جو بڑے بڑے ڈکٹیٹروں کو اقتدار کی گدی سے اتار پھینکتے ہیں۔

بھائیو! —— آج میں بہت خوش ہوں کیونکہ ایک سال کے قلیل عرصے میں ہماری انقلابی جماعت مضبوط و منظم بنیادوں پر استوار، عوام کے درمیان موجود ہے۔ پاکستان کے گوشے گوشے میں پارٹی کی تنظیمی شاخیں کھل رہی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ہماری پارٹی کو عوام کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ لیکن راستہ ابھی بڑا کٹھن ہے جسے ہم کو سخت محنت اور ہمت اور استقلال سے طے کرنا ہے۔ مشکلات بہت ہیں لیکن ہم مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کریں گے۔ ابھی منزل بہت دور ہے۔ اس لیے

حصولِ منزل کی لگن میں آگے بڑھو، بڑھتے چلو۔ ملک کے غریب عوام، مزدور، کسان اور طالب علم تم کو مدد کے لیے پکار رہے ہیں، جاؤ اور انھیں سہارا دو۔ میرا حکم ہے کہ عوام کی خدمت کو اپنا فرضِ اولین سمجھو —— مجھے فخر ہے کہ ہماری پارٹی میں ایسے کارکنوں کی کمی نہیں جو ہیرے اور جواہرات سے زیادہ قیمتی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ ایک دن وہ سیاست کے آسمان پر آفتاب اور ماہتاب کی طرح طلوع ہوں گے حالانکہ اس سے پہلے کسی نے سیاست کے میدان میں ان کا نام کبھی نہ سُنا ہوگا۔ آپ کو یاد ہوگا میں نے کہا تھا ہماری پارٹی کو بڑے بڑے ناموں کی ضرورت نہیں۔ یہ پارٹی تو خود بڑے بڑے نام پیدا کرے گی۔ لیکن عظیم نام، عظیم کام اور خدمت سے پیدا ہوتا ہے۔ آپ کو چاہیے، ہر وقت اپنے کام کا جائزہ لیں اور پارٹی میں تنقید اور خود تنقید کا عمل جاری رکھیں۔ کیونکہ یہی عمل پارٹی کو نکھارتا، سنوارتا اور مضبوط و منظم کرتا ہے —— حکومت ہر وقت یہ اعلان کرتی رہتی ہے کہ میں اکیلا اور تنہا ہوں، میرا کوئی دوست اور ساتھی نہیں۔ یہ جھوٹ ہے، آپ میرے ساتھ ہیں۔ پاکستان کے عوام میرے ساتھ ہیں۔ خدا میرے ساتھ ہے۔

محترم میر صاحب! —— میری آپ سے گذارش ہے کہ اب آپ ایک ایک لمحے کو بہت قیمتی سمجھیں۔ وقت آگیا ہے جب ہمیں رات دن کام کرنا ہوگا۔ یہ نہ ہو کہ دو چار روز یہ جوش و خروش اور ولولہ رہے اور پھر جذبات سرد پڑ جائیں اور ہم گھر بیٹھ رہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ہم میں یہ کمزوری ہے کہ ہم بہت جلد جوش میں آجاتے ہیں لیکن پھر جلد ہی یہ جذبہ سرد پڑنے لگتا ہے۔ اگر جوش و ہوش دونوں کو برقرار رکھا جائے تو جذبہ اور ولولہ کبھی کم نہیں ہوتا۔ اب مایوسی اور ناامیدی کے دن گذر گئے ہیں۔ اس لیے آپ جماعت کے تمام کام انتھک جد و جہد اور جوش و خروش سے شروع کردیں۔ آپ کی پارٹی کے پاس ایک مکمل اور جامع پروگرام ہے۔ اس پروگرام کو اچھی طرح سمجھ کر اسے ملک کے ایک ایک حصّے، ایک ایک گاؤں اور ایک ایک شہر تک لے جائیے —— آپ قوم کو ایک عوامی جد و جہد کے لیے تیار کریں —— یہ ایک عوامی پروگرام ہے اس لیے اس پروگرام کو عوام تک لے جائیے۔ یہ پروگرام تمام مظلوم طبقات کی آزادی کی آواز ہے۔ اس لیے اسے مزدوروں، کسانوں، محنت کشوں، طالبعلموں اور تمام غریب اور مجبور کسانوں تک لے جائیے —— یہ پروگرام ملک کے بیس خاندانوں کی لوٹ کھسوٹ اور اجارہ داری کا خاتمہ کردے گا۔ اس لیے یہ پروگرام تمام محبِ وطن عناصر کے دل کی آواز ہے —— آپ بیس خاندانوں کو چھوڑ کر تمام محبِ وطن عناصر کو متحد و منظم کریں —— اسی بنیاد پر ایک وسیع تر قومی جمہوری محاذ قائم کیجیے۔ آپ کے لیے ضروری ہے کہ اس پروگرام پر عملدرآمد کرنے کے لیے ایک مزدور سے لے کر درمیانہ کسان تک اور درمیانہ کسان سے محبِ وطن زمیندار تک تمام افراد کو ساتھ لیجیے۔ آپ کے پاس ایک عوامی پروگرام ہے۔ ایسے پروگرام اور منشور ہی عوامی تبدیلیاں لاتے اور سیاسی و معاشی انقلاب برپا کرتے ہیں۔ ٹھوس پروگرام اور نظریات کی بنیاد پر جو جد و جہد کی جاتی ہے اور جو سیاسی اور معاشی تبدیلیاں وجود میں آتی ہیں وہ ہمیشہ دائم و قائم رہتی ہیں۔ آپ ہی بتائیے اس سے بہتر اور کونسا منشور ہوگا۔

"اُسلام ہمارا دین ہے، جمہوریت ہماری سیاست ہے، سوشلزم ہماری معیشت اور طاقت کے مالک عوام ہیں" —— یہ منشور اور پروگرام آپ کی فتح کا علمبردار ہے۔ یقیناً فتح عوام کی ہوگی۔ جلد از جلد عوام تک پہنچیے، جلسے کیجیے اور عوام کو جد و جہد کا پیغام دیجیے۔ عوام آپ کی آواز پر لبیک کہنے کو تیار بیٹھے ہیں میری تمنّا ہے کہ ہر جگہ اور ہر مقام پر میں آپ کے شانہ بشانہ انقلابی جد و جہد میں شریک ہو سکوں۔ لیکن آپ کو معلوم ہے مجھ پر کتنی ذمہ داریاں ہیں۔ مجھے ایک علاقے میں نہیں بلکہ سارے پاکستان میں کام کرنا ہے۔ ہر جگہ جماعتی تنظیم کے کام کی دیکھ بھال کرنی ہے پھر آپ جانتے ہیں ان کے علاوہ میری اور بہت سی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ آپ لوگ میری غیر موجودگی کا احساس کیے بغیر اپنا کام مسلسل جاری رکھیں —— مجھے معلوم ہے عوام اس کنونشن میں جوق در جوق میرے خیالات کو سُننا چاہتے تھے لیکن مجھے افسوس ہے کہ پنڈال حیدرآباد کے عوام کے لیے ناکافی ہے۔ انشاءاللہ میں جلد از جلد حیدرآباد میں ایک جلسۂ عام منعقد کروں گا تاکہ کھل کر عوام سے بات چیت ہو سکے۔ اس قسم کے جلسۂ عام مجھے کراچی، پشاور، کوئٹہ، ملتان اور مشرقی پاکستان میں بھی منعقد کرنے ہیں۔ میں نے لاہور کے عوام سے بھی جلسۂ عام کا وعدہ کر رکھا ہے لیکن یہ جلسہ کسی بہتر اور خاص وقت کیا جائے گا کیونکہ یہ بڑی عظیم قومی اہمیت کا حامل ہوگا۔ میں اس میں جنگ اور اعلانِ تاشقند کے موضوع پر ایک تاریخی تقریر کروں گا۔ لاہور میں اس لیے اس موضوع پر خاص طور پر تقریر کی جائے گی کیونکہ دشمن نے اسی شہر پر پہلا حملہ کرکے جارحیت کا آغاز کیا تھا اور اسی شہر نے اعلانِ تاشقند کی مخالفت میں سب سے پہلے خون دیا تھا۔

ظالمو! —— میں نے دو سال اور چار ماہ تک تمھارے ہر قسم کے ظلم و ستم سہے اور صبر کیا۔ لیکن ظلم و ستم کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے —— اب میرے صبر کا پیمانہ چھلک اُٹھا ہے۔ تم ظلم و ستم میں یوں اندھے ہوگئے ہو کہ اب تمھیں پاکستان کی عزّت و وقار کا بھی خیال نہیں۔ آخر میں اس ملک کا وزیر خارجہ تھا۔ وہ وزیر خارجہ جس نے جنگ کے دوران دشمن ملک کی سازشوں کو بے نقاب کیا تھا اور ہر محاذ پر اس سے مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ جس کی ذہانت اور استقلال کو دیکھ کر دشمن تک یہ کہنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ کاش! ہمارے چالیس کروڑ عوام میں ایک ذوالفقار علی بھٹو ہوتا —— میں وہی ذوالفقار علی بھٹو ہوں جس نے جنگ کے دوران سلامتی کونسل میں قوم کے نمائندے کی حیثیت سے کشمیری عوام کی آزادی اور پاکستان پر ہندوستان کے جارحانہ حملے کے سلسلے میں مقدمہ لڑا تھا —— اب تم خود اس قومی نمائندے کو ملک کی عدالتوں میں مجرم کی حیثیت سے پیش کرنے پر کمربستہ ہو۔ خیال کرو اس اقدام سے پاکستان کے دشمن کس قدر بغلیں بجائیں گے۔ میں وہی بھٹو ہوں جس کے نام سے آج بھی سامراجیوں اور ہندوستان کے توسیع پسندوں کو پسینہ آجاتا ہے۔ یاد کیجیے! میں وہی بھٹو ہوں جسے آپ نے ایک مشکل گھڑی، ایک نازک کام کے سلسلے میں عوامی جمہوریہ چین روانہ کیا تھا اور جب میں وہاں سے کامران واپس آیا تھا تو آ[illegible] نے مجھے سینے سے لگا کر کہا تھا "بھٹو! تمھارے سوا اور کوئی بھی یہ کام سرانجام نہیں

دے سکتا تھا۔ قوم ہمیشہ تمھاری شکرگزار اور احسان مند رہے گی —" کیا یہی ہے وہ شکرگزاری جو آپ الزامات کی صورت میں آج مجھے دے رہے ہیں۔ کون تھا وہ شخص جس کی ایک آواز پر انڈونیشیا کے عظیم فرزند سوئیکارنو نے اپنی آبدوزیں اور جہاز پاکستان کی مدد کے لیے روانہ کیے تھے۔ میرا چیلنج ہے کہ اب آپ آبدوزیں تو کیا انڈونیشیا سے ایک اسکرو تک حاصل نہیں کر سکتے۔ آپ نے نہ صرف مجھ سے، بلکہ اپنے تمام دوست اور محسن ممالک کے عوام سے غداری کی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ آپ کو دوست اور دشمنوں میں تمیز ہو گئی ہے۔ یہ جھوٹ ہے۔ آج بھی آپ نے ملک و قوم کے دشمنوں سے ہاتھ ملا رکھا ہے اور دوست ممالک کے ساتھ منافقت میں مشغول ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے اندرونِ ملک اور بیرونِ ملک تمام محبِ وطن عوام اور اقوام کی ہمدردی کھو دی ہے۔ اور کل جس ذوالفقار علی بھٹو کو آپ نے گلے لگایا تھا آج اپنے تحصیلداروں کے ذریعے اس کی بے عزتی کروانا چاہتے ہیں — میں تمھارے تحصیلداروں سے نہیں ڈرتا — میں تم سے نہیں ڈرتا — میں صرف خدا سے ڈرتا ہوں۔

میرے پیارے بھائیو! ملک اور قوم پر بڑا نازک وقت آنے والا ہے۔ مُلک میں انتہائی شدید سیاسی کش مکش کے آثار نمایاں ہو چلے ہیں۔ آپ جانتے ہیں میری ہمیشہ سے یہی کوشش رہی ہے اور میں ہمیشہ یہ کوشش کرتا رہوں گا کہ ملک میں حزبِ اختلاف کی جماعتوں کے درمیان کسی سیاسی اور اقتصادی پروگرام کی بنیاد پر اتفاق ہو جائے۔ ہم کم از کم پروگرام کی بنیاد پر اصولی اتحاد کے لیے ہمیشہ تیار ہیں۔ ہم ان مسائل کی بنیاد پر تمام حزبِ اختلاف کی جماعتوں کو اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتے ہیں جیسے جمہوریت کی بحالی اور سوشلزم کا قیام، شہری آزادیاں، عوام کے بنیادی حقوق، حقِ بالغ رائے دہی، آزاد خارجہ پالیسی، عدلیہ کی آزادی، پریس کی آزادی وغیرہ — لیکن ہم سوشلزم کے علمبردار یہ سمجھتے ہیں کہ اقتصادی آزادی اور پروگرام کے بغیر سیاسی آزادی اور حقیقی جمہوریت کا قیام ناممکن ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ اس پروگرام اور منشور میں اہم اقتصادی اور معاشی مسائل کو بھی شامل کیا جائے۔ ان مسائل میں جاگیرداری نظام کا خاتمہ، کسانوں کے حقوق کا تحفظ، مزدوروں کے حقوق، اُجرتِ محنت اور روزگار کا تحفظ، حقِ ہڑتال کی بحالی، تمام کلیدی اور بنیادی صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینا، ذرائع آمد و رفت اور ٹرانسپورٹ کو قومی ملکیت میں لینا، تعلیم کی تجارت کو بند کرنا اور تعلیم کو عام کرنا شامل ہیں۔ ان جیسے بنیادی اہم نکات پر اتفاق ہو سکتا ہے۔ بہرحال قومی جمہوری اتحاد کے لیے ہم ہر وقت تیار ہیں۔

ساتھیو! — میرے بارے میں کہا جاتا ہے کہ میں دولت مند اور سرمایہ دار ہوں اس لیے اُس وقت تک مجھے سوشلزم کے لیے جدوجہد کرنے کا کوئی حق نہیں جب تک میں اپنی تمام دولت اور جائداد عوام میں تقسیم نہ کر دوں۔ میں ان افراد کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی ایک فرد کی تمام دولت عوام میں تقسیم کر دینے سے سوشلزم کا قیام عمل میں نہیں آ سکتا۔ سوشلزم کا قیام تو اس وقت ہوتا ہے جب ملک کے تمام ذرائع پیداوار اور وسائلِ دولت، تمام کھیت اور کھلیان اور کارخانے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے چھین کر قومی ملکیت میں لے لیے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی میں اعلان کرتا ہوں کہ اگر میری دولت قوم کے کسی کام آ سکتی ہے تو میں اپنی تمام دولت قوم پر نچھاور کر دوں گا — لیکن میں اتنا بے وقوف نہیں کہ سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی موجودگی میں اپنی دولت اپنے ہاتھ سے سرمایہ دار اور جاگیردار حکمرانوں کے سپرد کر دوں تاکہ ان کی عیاشیوں اور ذاتی جائداد میں مزید اضافہ ہو سکے۔ اگر حکومت میں جرأت ہے تو وہ سوشلسٹ نظامِ حکومت قائم کرے۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری کے خاتمے کا اعلان کرے تو پھر میں سب سے پہلے اپنی دولت کو قومی ملکیت میں دینے کے لیے تیار ہوں۔

تم یہ فضول باتیں کر کے عوام کو بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں سوشلزم کا قائل ہوں اسی لیے میں اپنے طبقے اور حکومت کو چھوڑ کر مزدوروں، کسانوں اور غریب طالب علموں میں واپس چلا آیا ہوں۔ مجھے اپنے مفلوک الحال عوام سے پیار اور محبت کے سوا کیا مل سکتا ہے — میں سوشلزم کا پیرو ہوں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اسی نظام میں عوام کی نجات، ترقی اور خوشحالی مضمر ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس حق و صداقت، عدل و انصاف، مساوات اور انسانی عظمت کے نظام کو پاکستان میں قائم ہونے سے نہیں روک سکتی — یہی وقت اور تاریخ کا تقاضا ہے۔ آؤ اور دیکھ لو۔ میں سوشلزم کا عظیم انقلابی پرچم لے کر عوام کی خدمت کے لیے میدان میں نکل آیا ہوں — میرے دل میں کوئی ہوس اور لالچ نہیں — میں سوشلسٹ ہوں اور ایک ایمان دار سوشلسٹ کی حیثیت سے غریبوں کے لیے آخری دم تک جنگ کرتا رہوں گا۔ جب میں سوشلزم کا نعرہ لگاتا ہوں تو کچھ لوگ میرا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن مجھے ان لوگوں کی قطعی کوئی پروا نہیں — اس لیے کہ میرا ضمیر مجھ سے مطمئن ہے — یہ ٹھیک ہے کہ سوشلزم کا قیام اس وقت تک عمل میں نہیں آ سکتا جب تک کہ اس عظیم جدوجہد کی قیادت مزدوروں، کسانوں اور مظلوم عوام کے ہاتھوں میں نہ ہو، لیکن میں اپنا مذاق اڑانے والوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ سوشلسٹ انقلابات کی تاریخ میں ایسے بے شمار انسان نظر آتے ہیں جو دولت مند ہونے کے باوجود اپنے اور اپنے طبقے کے مفادات کو چھوڑ کر عوام کے درمیان چلے آئے اور انھوں نے مزدوروں، کسانوں اور مظلوم طبقے کے مفادات کے تحفظ کے لیے خود اپنے ہی طبقے کے خلاف جدوجہد کا عَلَم بلند کیا۔ میں ان ہی افراد میں سے ہوں۔

ایسے افراد فرانسیسی انقلاب میں بھی تھے جنھوں نے غریب عوام سے مل کر ظالم آقاؤں کے خلاف آزادی، مساوات اور حرّیت کا نعرہ لگایا۔ ایسے لوگ رُوس کے عظیم انقلابِ اکتوبر میں بھی تھے جنھوں نے زارِ شاہی کا تختہ اُلٹ کر دنیا کی تاریخ میں پہلی بار مزدور اور محکوم طبقے کی حکمرانی قائم کی — ایسے ہی انقلابی چین میں بھی تھے جنھوں نے چین میں جاگیرداری، سرمایہ داری اور سامراجیت کے ظلم و ستم کو شکست دے کر انسانی عظمت، مساوات اور آزادی کا وہ عظیم سوشلسٹ انقلاب برپا کیا جس کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ میں ان اہلِ قریش کی طرح ہوں جنھوں نے دولت اور امارت کو ٹھکرا کر رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)

کا ساتھ دیا اور ایک اسلامی انقلاب برپا کیا جس نے انسانیت کو آزادی، مساوات اور امن و آشتی کا پیغام دیا۔ میں پاکستان میں ایسا ہی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہوں۔ میری کوشش ہے کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی عوامی جمہوری محاذ قائم ہو۔ میں اقتدار نہیں چاہتا اور یہ غلط ہے کہ مجھے اقتدار کی ہوس ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انتخابات کے ذریعے آمریت کا خاتمہ نہیں کیا جا سکتا۔ آمریت کا خاتمہ صرف عوامی جدوجہد سے کیا جاتا ہے۔ ووٹ اور پرچی کی اہمیت صرف جمہوریت میں ہے، آمریت میں یہ سب کچھ بے کار ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آنے والے انتخابات میں حصہ نہ لیا جائے اور آمریت کا مقابلہ نہ کیا جائے —— مادرِ ملت نے آمریت کا مقابلہ کیا۔ عوام ان کے ساتھ تھے، لیکن آمریت پھر بھی برقرار رہی —— لیکن اگر مادرِ ملت انتخابات میں بالکل حصہ نہ لیتیں، تو اس قوم کو کتنا بڑا نقصان ہوتا: آج یہ جذبہ، یہ ولولہ، یہ جوش و خروش کہاں سے آتا؟

یہ ٹھیک ہے کہ آنے والے انتخابات میں حکومت عوام پر ہر قسم کے ظلم و ستم ڈھائے گی لیکن اس کے باوجود ہم انتخابات ضرور لڑیں گے تاکہ عوام کو متحد اور منظم کیا جائے۔ انھیں آمریت کے خلاف جدوجہد پر کمربستہ کیا جائے اور انھیں ظلم و ستم کے خلاف لڑنے پر آمادہ کیا جائے۔ سوشلزم کا اصول ہے کہ ہر عوامی تحریک سے آمریت کمزور ہوتی جاتی ہے۔ ہم اس لیے انتخاب لڑیں گے کیونکہ آنے والا انتخاب آمریت کے قلعے میں ایک اور شگاف ڈال دے گا۔ آمریت اور کمزور ہو گی —— ہمیں آمریت کو آہستہ آہستہ مغلوب کرنا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ آمریت نے جنگ بند کی تو اس کا ایک حصہ کٹ کر گر گیا۔ اعلان تاشقند نے اس کا دوسرا حصہ کاٹ ڈالا، آمریت کمزور ہو گئی۔ کالاباغ کے زوال نے اس کا ایک بازو مفلوج کر دیا۔ میرے علیحدہ ہونے پر اس کا کچھ اور حصہ کٹ گیا۔ اب عوام کو چاہیے کہ آمریت کی بے دست و پا لاش کو متحد و منظم ہو کر باہر نکال دیں۔

میرے پیارے بھائیو! —— میری پوری کوشش ہے کہ سوشلزم اور جمہوریت کی بنیاد پر تمام مخالف جماعتوں کے درمیان ایک بااصول متحدہ محاذ قائم ہو لیکن اگر سوشلزم کے نام سے کچھ لوگوں کو بخار آتا ہے تو میں کہتا ہوں آنے والے انتخابات میں صرف جمہوریت اور اقتصادی پروگرام کی بنیاد پر کوئی اصولی محاذ قائم کر لیا جائے۔ میں اور میری پارٹی ایسے متحدہ محاذ کے لیے ہر وقت تیار ہیں۔ میرے لیے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہو گی کہ آنے والے انتخابات میں مشرقی پاکستان سے کوئی مناسب امیدوار کھڑا ہو۔ کیونکہ مشرقی پاکستان کے عوام کا ہم پر بہت حق ہے۔ اگر اس فرد پر عوام کو اتفاق اور اعتماد ہو گا تو سر آنکھوں پر —— میں اس امیدوار کے لیے ایک سپاہی کی طرح کام کروں گا۔ لیکن اگر مشرقی پاکستان سے کوئی صحیح امیدوار کھڑا نہیں ہوتا جس پر عوام کو اتفاق ہو تو پھر مغربی پاکستان سے اور کوئی میدان میں آئے، جسے عوام کا اعتماد حاصل ہو۔ اگر ایسا کوئی فرد میدان میں نکل آتا ہے تو میں اس کے لیے بھی ایک عام کارکن کی طرح کام کرنے کو تیار ہوں —— لیکن اگر مغربی اور مشرقی پاکستان سے کوئی عوامی آدمی میدان میں نہیں نکلتا تو —— لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھ کر میں خود میدان میں نکلوں گا۔ میں حیدرآباد کے عوام کے سامنے خدا کو حاضر ناظر جان کر کہتا ہوں کہ چاہے مجھ پر کیسے ہی ظلم و ستم ٹوٹیں، میں خود اس آمریت کا مقابلہ کروں گا۔ فتح یقیناً ہماری ہو گی۔

پاکستان پائندہ باد

طالب علم دنیا

فاروق اعظم

پشاور کا مشنری تعلیمی ادارہ —— ایڈورڈز کالج

ایڈورڈز کالج پشاور صوبہ سرحد کا ایک مشہور مشنری تعلیمی ادارہ ہے۔ اس کالج کے چند طلباء نے ہمیں اس کے متعلق بعض معلومات بہم پہنچائی ہیں تاکہ ہم پاکستان بھر کے طالب علموں کی توجہ اس طرف مبذول کرا سکیں۔ ان معلومات اور واقعات کی تحقیق ہم نے خود وہاں جا کر نہیں کی۔ لیکن بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ ان پر شک کیا جائے۔ اگر یہ حالات درست ہیں تو نہایت افسوسناک ہیں اور حکومت کو ان کی جانب فوراً توجہ دینی چاہیے۔

ایڈورڈز کالج کے طالب علم نہایت حق شناس، اصول پرست، نڈر، بے باک اور عوام دوست ہیں۔ جب ۷ر نومبر ۱۹۶۸ء کو راولپنڈی پولی ٹیکنیک کا سترہ سالہ طالب علم عبدالحمید پولیس فائرنگ سے شہید ہوا تو ۸ر نومبر ۱۹۶۸ء کو ایڈورڈز کالج کے طلباء نے دوسرے مقامی تعلیمی اداروں کے اشتراک سے ایک بہت بڑا جلوس نکالا اور سانحۂ راولپنڈی کی مذمت کی۔ اس سے قبل ۲۵ر اکتوبر ۱۹۶۸ء کو جب طالب علموں کے ہیرو اور عظیم پاکستانی رہنما چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو صوبہ سرحد کے دورے پر کراچی سے پشاور پہنچے تھے تو اس کالج کے تقریباً تمام طلباء چیئرمین بھٹو کے استقبال کے لیے ہوائی اڈے پر جمع تھے۔

ایڈورڈز کالج کے پرنسپل جناب فلپ ایڈمنڈز ہیں۔ جن کا تعلق آسٹریلیا سے ہے۔ پرنسپل صاحب کی طرح نائب پرنسپل صاحب بھی عیسائی ہیں۔ پرنسپل صاحب کے متعلق یہ بات کہی جاتی ہے کہ وہ "بچت" کے عادی ہیں۔ اگر ان کے سامنے کسی استاد کی تقرری کا معاملہ درپیش ہو تو وہ ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں [illegible] استاد پشاور سے نہ ہو۔ شاید اس لیے کہ وہ کالج کی بدعنوانیوں اور ناقص انتظامات کو دیکھ کر پرنسپل صاحب کے لیے خطرے کا باعث نہ بن [illegible]۔ جب کوئی

استاد کچھ عرصہ گذار لیتا ہے تو اس کو کسی نہ کسی بہانے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جاتا ہے۔ پرانے استاد کی تنخواہ کا سکیل وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہتا ہے۔ چنانچہ پرنسپل صاحب اس کی جگہ نئے استاد کو مقرر کر کے "بچت" کر لیتے ہیں۔

پرنسپل صاحب کی ایک بیگم صاحبہ ہیں جو ایڈورڈز کالج ہی میں دو عہدوں پر فائز ہیں۔ بیگم صاحبہ کا پہلا عہدہ یہ ہے کہ وہ باورچی خانے میں خوراک کا معائنہ کرنے پر مامور ہیں۔ اس باورچی خانے سے ہاسٹل کے طالب علموں کو کھانا سپلائی کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ بات دوسری ہے کہ بیگم صاحبہ کو شاذ و نادر ہی باورچی خانے میں دیکھا جاتا ہے۔ بیگم صاحبہ کا دوسرا عہدہ یہ ہے کہ وہ کالج کی ڈسپنسری میں ڈاکٹر کی حیثیت سے مامور ہیں۔ یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کالج کے پراسپکٹس میں کوالیفائڈ ڈاکٹر کا ذکر ہے۔ مگر بیگم صاحبہ ڈاکٹری کے عام اصول سے بھی نابلد ہیں۔ ہاسٹل کی ڈسپنسری کا اوّلین مقصد یہ ہوتا ہے کہ طالب علموں کو بوقتِ ضرورت طبی امداد پہنچائی جا سکے۔ لیکن ایڈورڈز کالج میں یہ دستور نہیں ہے۔ وہاں اگر کوئی طالب علم کمرے میں بیمار پڑا ہے تو کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ یہاں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ علاج معالجے کے لیے ایک خاص ماہانہ فنڈ طلباء سے وصول کیا جاتا ہے۔ یہ فنڈ کدھر جاتا ہے؟ یہ ایڈورڈز کالج کے کسی طالب علم کو معلوم نہیں ہے۔

ایڈورڈز کالج میں سائنس کے طالب علموں کے لیے خاطر خواہ اور تسلی بخش انتظامات نہیں ہیں۔ تجربہ گاہوں میں تجرباتی سامان کی سخت قلت ہے۔ سائنس کے بہت سے استاد ناتجربہ کار ہیں جو طالب علموں کو اپنے لیکچر سے مطمئن نہیں کر سکتے۔ تجربہ گاہوں میں پنکھوں کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ چنانچہ موسمِ گرما میں طالب علموں کا برا حال ہوتا ہے۔

سالِ اوّل کے ہاسٹل کا حال یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے کمروں میں چار چار پانچ پانچ طالب علم رہتے ہیں۔ بڑے کمروں میں گیارہ طالب علم رہتے ہیں ——— ان کمروں میں بھی بجلی اور پنکھوں کا خاطر خواہ انتظام نہیں ہے۔ حالانکہ ہر طالب علم سے کمرے کے دس روپے اور بجلی کا ماہانہ خرچ علیحدہ وصول کیا جاتا ہے۔ سالِ دوم کے ہاسٹل کا حال یہ ہے کہ کچھ لڑکے کچے کمروں میں رہتے ہیں۔ بارش کے دنوں میں ان کمروں کی چھتیں ٹپکتی ہیں۔ موسمِ گرما میں بعض اوقات چھت پر سے سانپ اور بچھو گرتے ہیں اس سے ہر وقت یہ خطرہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں کسی طالب علم کی جان نہ ضائع ہو جائے کالج کی انتظامیہ کو اس کی کوئی فکر نہیں ہے۔

کامن روم کی حالت کچھ اس طرح ہے اس میں ایک پرانا اور ٹوٹا پھوٹا ریڈیو ہے فرنیچر کی حالت بھی قابلِ رحم ہے یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ کامن روم کا فنڈ ۲ روپے ماہانہ الگ وصول کیا جاتا ہے۔ غسلخانے اور لیٹرینیں بھی ناقص انتظام کا شکار ہیں ان میں بجلی اور [illegible] کا مناسب انتظام نہیں ہے۔

ایڈورڈز کالج میں فیسوں کی شرح علاقے کے دوسرے کالجوں کی نسبت بہت زیادہ ہے۔ [illegible] گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی (میڈیکل) کے سال اول کی فیس تقریباً ۱۶ روپے ہے لیکن ایڈورڈز کالج میں اسی درجے کی فیس ۲۲ روپے سے بھی زیادہ ہے جرمانوں کی بھی انتہا ہے۔ معمولی سے معمولی غلطی پر بھی پانچ دس روپے سے کم جرمانہ نہیں کیا جاتا جس کو ادا کرنا طالب علموں کے لیے ایک دشوار مسئلہ بن جاتا ہے عام کالجوں میں اگر کوئی طالب علم صبح کے وقت پی ٹی میں غیر حاضر رہے تو اس پر ۴ آنے جرمانہ عائد کیا جاتا ہے لیکن ایڈورڈز کالج میں اس قسم کے جرمانے کی شرح ۲ روپے ہے۔

موجودہ دور جمہوریت کا ہے تحریر و تقریر کی آزادی کی قدر اور حمایت ہر شخص کرتا ہے لیکن یہ امر قابل افسوس ہے کہ ایڈورڈز کالج میں طالب علموں کی کوئی یونین نہیں ہے۔ اگر کوئی طالب علم اس موضوع پر بات کرتا ہے یا یونین کے قیام کا مطالبہ کرتا ہے تو اس کو فوراً کالج سے باہر نکال دیا جاتا ہے۔ ایڈورڈز کالج میں چند انجمنیں ہیں جن کے ارکان مل کر سٹوڈنٹس کونسل بناتے ہیں اس سٹوڈنٹس کونسل کا ایک جنرل سیکرٹری ہوتا ہے جس کو پرنسپل صاحب اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق نامزد کرتے ہیں اکثر اوقات یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ سٹوڈنٹس کونسل کے ارکان ایسے طالب علم ہوتے ہیں جو خود اپنے خیالات کا اظہار اچھی طرح نہیں کر سکتے۔ ایڈورڈز کالج کے اکثر طالب علم ان کو "گونگے" کے نام سے تعبیر کرتے ہیں سٹوڈنٹس کونسل کے ارکان پرنسپل صاحب کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوتے ہیں۔

ایڈورڈز کالج کے دفتر میں بدعنوانیاں عام ہیں۔ جب طالب علموں کے وظائف آتے ہیں تو مہینوں تک دفتر میں پڑے رہتے ہیں حالانکہ طالب علموں کو ان کی اشد ضرورت ہوتی ہے جب وظائف طالب علموں کو دینے کا وقت آتا ہے تو "کلرک بادشاہ" زیادہ سے زیادہ رقم اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرتے ہیں بسا اوقات تو پورے کا پورا وظیفہ ہی غائب ہو جاتا ہے اب وہ وظیفہ کدھر جاتا ہے؟ یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا ہے۔

طالب علم قوم کا فعال اور مؤثر طبقہ ہوتے ہیں آج کل کے دور میں طالب علم انقلاب کے ہراول دستے کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں یہ طالب علم ہی تھے جنہوں نے قائداعظم محمد علی جناح کی آواز پر لبیک کہی اور تحریک پاکستان کو جلا بخشی۔ پاکستان میں ایوب آمریت کے قصر کو گرانے کے لیے طالب علموں کا ایک منفرد اور جداگانہ رول ہے جس سے کوئی شخص بھی انکار نہیں کر سکتا۔ طالب علم مستقبل کے حکمران ہیں ان کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہایت ہی قابل افسوس اور قابلِ مذمت ہے پاکستان کے کسی حصے میں بھی کوئی مشنری تعلیمی ادارہ ہو حکومت کو اس کی سرگرمیوں اور اندرونی فضا سے باخبر رہنا چاہیئے اصل میں ایسے مشنری تعلیمی ادارے غیر ملکیوں کے ایسے اڈے ہیں جو ہماری نئی پود کو خراب کر رہے ہیں اور پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے لیے زہر کی مثل ہیں ہمیں اس سے ہوشیار رہنا چاہیئے۔ انڈونیشیا کے عظیم قائد ڈاکٹر عبدالرحیم سوئیکارنو کا تختہ الٹنے اور وہاں کے بارہ لاکھ مسلمانوں کا قتل عام کرانے میں وہاں کے مشنری تعلیمی اداروں نے جس قدر امریکن سی آئی۔ اے سے تعاون کیا اور بذاتِ خود حصہ لیا وہ ہمارے سامنے ہے۔ ایک عرصے سے پاکستان کے عوام یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ حکومت کو مشنری تعلیمی اداروں کو اپنی تحویل میں لے لینا چاہیئے تاکہ ہمارے طالب علم ایک خوشگوار اور آزادانہ ماحول میں تعلیم حاصل کر سکیں لیکن نہ جانے آج تک ہمارے اصحابِ اقتدار ایسا قدم کیوں نہیں اٹھا سکے ہیں؟ یہ نکتہ سوچنے کا ہے۔ پاکستان بھر کے طالب علموں کو اس کے متعلق سوچنا چاہیئے۔

مغربی پاکستان بار کونسل کے انتخابات ۲۲، نومبر ۱۹۶۹ء کو منعقد ہو رہے ہیں جن میں پاکستان پیپلز پارٹی سے وابستہ مندرجہ ذیل مقتدر وکلاء بھی حصّہ لے رہے ہیں :۔

(۱) رائے خورشید علی خان (ساہیوال) (۲) ملک یعقوب اعوان (لائل پور) (۳) خورشید حسن میر (راولپنڈی) اور (۴) صاحبزادہ احمد رضا خان قصوری (لاہور) تمام عوام دوست وکلاء سے توقع ہے کہ وہ اپنے ان ساتھیوں کی کامیابی کے لیے بھرپور تعاون کریں گے ۔

خورشید حسن مِیر

(۱) قومی مسائل میں عملی دلچسپی کی بنا پر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن جموں (ریاست جموں وکشمیر کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور ۱۹۴۲ء میں جموں میں یوم پاکستان منعقد کرنے کے جرم میں ڈیفنس آف کشمیر رولز کے تحت گرفتار کر لیے گئے ۔

(۲) ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۶ء تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور آخری سال یونیورسٹی یونین کے سیکرٹری کے طور پر تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصّہ لیا ۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات کے دوران اپنے ساتھیوں کے ہمراہ لاہور اور گجرات کے اضلاع میں مسلم لیگ کے امیدواروں کے لیے گاؤں گاؤں کام کیا ۔

(۳) ۱۹۴۸ء کے شروع میں کشمیر کی جنگِ آزادی میں حصّہ لینے کے لیے آزاد کشمیر فوج میں شامل ہو گئے اور محاذ پر بطور کمپنی کمانڈر کام کیا ۔

(۴) ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات کے دوران راولپنڈی میں متحدہ حزبِ اختلاف کی رہبر کمیٹی کے سیکرٹری منتخب ہوئے اور اس طرح مادرِ ملّت کی صدارتی انتخابات کی مہم کے دوران ایوبی آمریت کے خلاف سرگرم حصّہ لیا ۔

(۵) راولپنڈی میں پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین ہیں ۔

(۶) ۱۹۶۶ء سے راولپنڈی کی افریشیائی استحکام کمیٹی کے صدر ہیں ۔

(۷) ۱۹۶۷ء میں راولپنڈی بار ایسوسی ایشن کا صدارتی انتخاب لڑا۔ فریقین کے ووٹ برابر رہے ۔ ایک ماہ بعد پھر انتخابات ہوئے جن میں کامیاب امیدوار سے صرف ۷ ووٹ کم حاصل کیے ۔

(۸) ایوبی آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لینے کی بنا پر ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار ہوئے اور رہا ہونے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے مقدمے میں ان کے ایک وکیل کے فرائض انجام دیے ۔

احمد رضا خان قصوری

۱۔ دورِ ایوبی میں انہیں طالب علم تحریک میں دوبار کالج سے نکالا اور گرفتار کیا گیا ۔

(۲) یونیورسٹی آرڈیننس کا پہلا نشانہ احمد رضا خان ہی بنے اور لاء کالج سے دو سال کے لیے نکالے گئے ۔

(۳) دورِ ایوبی میں عوامی تحریک کے دوران ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار ہونے والے بارہ افراد میں بھٹو صاحب کے ساتھ احمد رضا خان بھی تھے ۔

(۴) آر سی ڈی یوتھ آرگنائزیشن کے صدر رہے اور پاک ٹرکش کلچرل ایسوسی ایشن کے سیکرٹری کے فرائض بھی انجام دیے ۔

(۵) ۱۹۶۸ء میں ایک انقلابی تقریر کرنے کی بنا پر ضلعی حکام کی طرف سے ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت گرفتار کرنے کی دھمکی ملی ۔

(۶) لاہور ہائی کورٹ میں آنے سے پیشتر قصور بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری تھے ۔

(۷) ۱۴، جون ۱۹۶۹ء کو صدرِ مملکت نے ان کو قومی مسائل پر بحث کرنے کے لیے راولپنڈی بلایا۔ حزبِ اختلاف کی طرف سے بلائے جانے والے حضرات میں ان کا نواں نمبر تھا ۔

(۸) پاکستان پیپلز پارٹی کے فاؤنڈر ممبروں میں سے ہیں اور پنجاب بہاولپور تنظیمی کمیٹی کے رکن ہیں ۔

احمد رضا خان قصوری ایک نڈر، بے باک اور دیانتدار نوجوان ہیں ۔ ان کا مقصدِ عظیم اپنے ہم پیشہ وکلاء کے حقوق کے لیے جنگ کرنا ہے۔ اگر یہ کامیاب ہو گئے تو انشاء اللہ اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گے اور اپنے اس وعدے پر [illegible] تریں گے ۔

مودودیّت کا فتنہ بہت خطرناک ہے

لیکن محمدّ صفدر میر نے مودودیّت کے سومنات کو جس طرح پاش پاش کیا ہے
اُس نے اس فتنے کی ہوا اکھاڑ دی ہے

مودودیّت اور موجودہ سیاسی کشمکش

محمدّ صفدر میر کے اُن زبردست مضامین کا مجموعہ جنہوں نے مودودیّت کی صفوں میں کھلبلی ڈال دی ہے اور سامراج، سرمایہ داری اور جاگیرداری کے محافظوں کو بے نقاب کر دیا ہے

مضامین کی ایک جھلک

۱۔ صدر ایوب کے نام مودودی جماعت کی ایک مخلصانہ گزارش
۲۔ کیا مودودی جماعت ایک اسلامی جماعت ہے؟
۳۔ مودودی جماعت کی سیاسی اور معاشی قلابازیاں
۴۔ مودودیت اور اقبال
۵۔ مودودیت اور سرمایہ داری
۶۔ مودودیت اور نوآبادیاتی نظام
۷۔ مودودیت — اقبال — سوشلزم
۸۔ مودودیت اور سامراج
۹۔ مودودیت اور پاکستانی قومیّت
۱۰۔ مودودیت اور سوشلزم کی مخالفت

ایک بحرانی لمحے میں، جب عوامی رہنمائی کا دعویٰ کرنے والے، عوام کو ایک ایسی غیر عوامی اور بھارت نواز جماعت کے پاس بیچنے کو تیار ہو چکے ہوں جس نے تحریکِ پاکستان، جہادِ کشمیر اور تحریکِ مساوات کی مخالفت کی ہو اس بات کی اشد ضرورت تھی کہ کہیں سے کوئی آوازۂ حق بلند ہو۔ جو عوام کو خبردار کر کے اس ناپاک سازش کو بے نقاب کر دے

یہ آوازۂ حق **محمدّ صفدر میر** نے بلند کیا جو ہفت روزہ **نصرت** کے ذریعے لاکھوں عوام تک پہنچا اور اب کتابی صورت میں شائع ہو گیا ہے

"مودودیّت اور موجودہ سیاسی کشمکش" ایک کتاب ہی نہیں
ہماری عوامی تحریک کی ایک درخشاں اور ولولہ انگیز فتح ہے

قیمت تین روپے

آفسیٹ پر

البیان، چوک انارکلی، لاہور

وہ فضائی میزبان جن کو ساری دنیا نے سراہا ہے اب "پرل روٹ" پر پرواز کر رہی ہیں

ڈھاکہ

بنکاک

منیلا

ٹوکیو

(ہفتے میں دو جیٹ پروازیں)

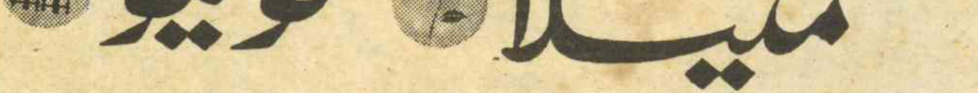
ماسکو
لندن
فرینکفرٹ
استنبول
پیرس
جنیوا
روم
تہران
دمشق
بیروت
بغداد
کویت
بحرین
ظہران
دوہا
دوبئی
جدہ
قاہرہ
کراچی
کابل
پشاور
راولپنڈی
لاہور
کھٹمنڈو
ڈھاکہ
چٹاگانگ
رنگون
بنکاک
منیلا
شنگھائی
کینٹن
ٹوکیو

مزید تفصیلات کیلئے اپنے ٹریول ایجنٹ یا کسی پی۔ آئی۔ اے آفس سے رجوع فرمائیں۔

PIA پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز

IAL 166-9/69

ہفت روزہ نصرت لاہور ــــــــــــــــ رجسٹرڈ نمبر ایل : ۵۴۸۷
صدر دفتر : چوک انارکلی ، لاہور ــــــــ فون : 66606
محمد حنیف رامے نے شیخ حامد محمود کے زیر اہتمام نوائے وقت پرنٹرز لاہور میں چھپوا کر شائع کیا

شہید عبد الحمید

راولپنڈی پولی ٹیکنیک کے اس سترہ سالہ طالب علم نے ۷ ، نومبر ۱۹۶۸ء کو عوامی تحریک کی مانگ اپنے خون سے بھر دی ۔

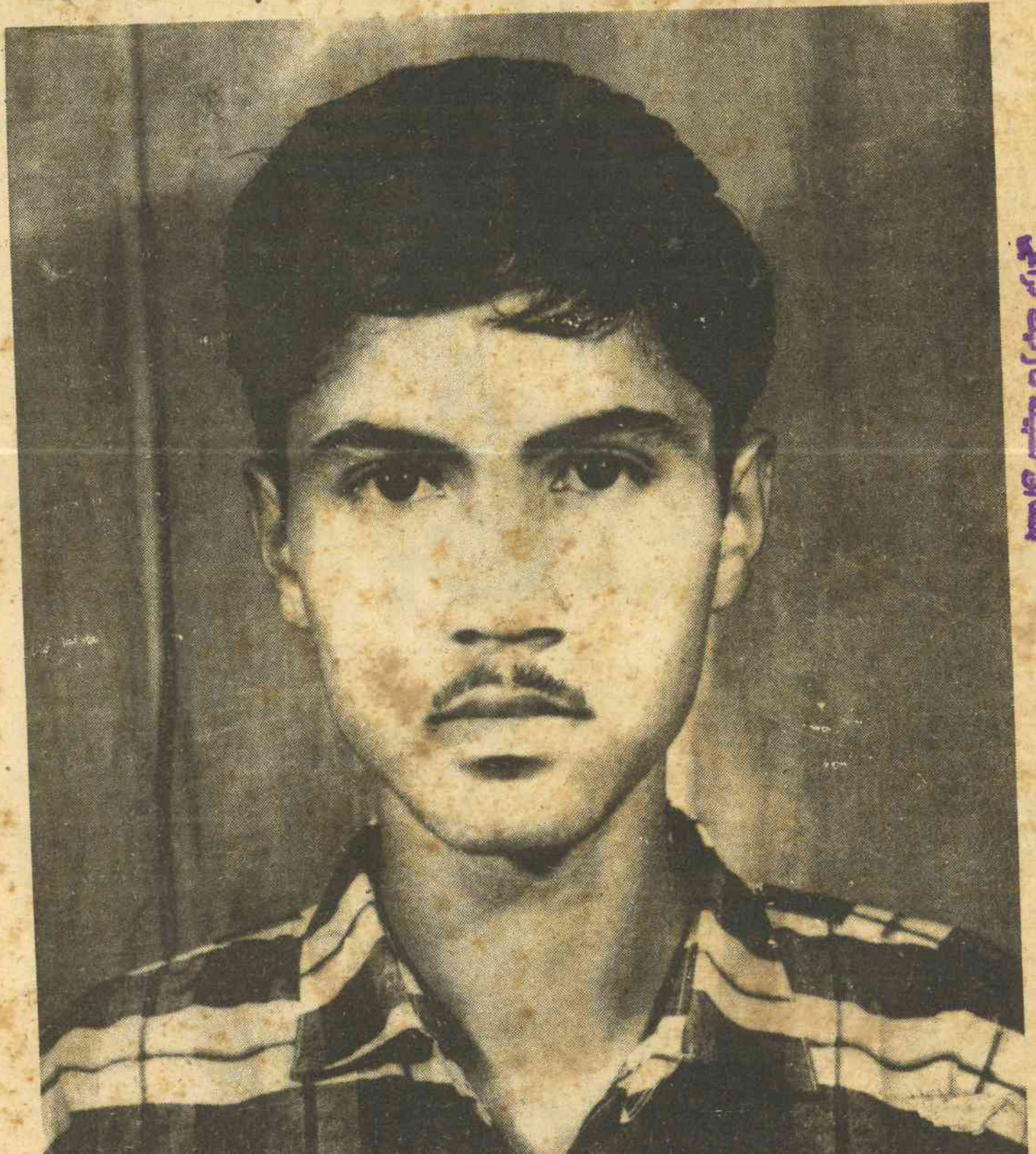

[illegible]
بک اسٹال اینڈ لائبریری
ملحقہ لسبیلہ مارکیٹ کراچی